إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ

علمی، دینی، اصلاحی اور معلوماتی

اللطیف

دار العلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللطیف ویلور

سالنامہ
۱۴۲۲ھ 2001

۴۰ واں شمارہ

بیادگار

★ شیخ المشائخ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی ابو النصر قطب الدین سید شاہ محمد باقر قادری

رحمۃ اللہ علیہ۔ سجادہ نشین، مکان حضرت قطب ویلور۔

★ مولانا مولوی ابو صالح عماد الدین سید شاہ محمد ناصر قادری المعروف بہ میراں پاشاہ

رحمۃ اللہ علیہ

مدیر موسس

★ حضرت اقدس مولانا ابو الحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اجراء: مورخہ ۱۰؍ شعبان المعظم سنہ ۱۴۲۲ھ مطابق 28؍ اکتوبر سنہ 2001ء بروز اتوار

● زیرِ نگرانی:

مولانا مولوی ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری ایم اے، پی ایچ ڈی، بی کام (عثمانیہ) ادیب فاضل (مدراس) ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور۔

● ●

مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری ادیب فاضل (مدراس) نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ ویلور

● زیرِ ادارت:

مولانا مولوی پی۔ محمد ابو بکر ملیباری لطیفی قادری۔ مدرس دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

مولانا مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی ایم اے، مدرس دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

● نمائندگانِ طلباء:

۱	سید خلیل احمد قلندری	گجیندر گڈھ	کرناٹکا
۲	محمد حنیف	ویلور	ٹمل ناڈو
۳	حافظ شیخ جیلانی	بلہاری	کرناٹکا
۴	حافظ محمد نبی لال بھولا	بیجاپور	کرناٹکا
۵	مولوی جی۔ اے۔ حمزہ	بائیم باڑی	کرناٹکا
۶	مولوی کے۔ محمد شفیق	مالاپرم	کیرالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین سالنامہ اللطیف ویلور سنہ ۱۴۲۲ھ مطابق سنہ 2001ء

رُباعیات

حضرت سرمد شہید علیہ الرحمۃ

از جرم فزوں یافتہ ام فضل ترا
ایں شد سبب معصیت بیش مرا
ہر چند کرم بیش گنہ بیشتر است
دیدم ہمہ جا و آزمودم ہمہ را

ترجمہ

ہر جرم سے پایا ہے سوا فضل ترا
باعث یہ فزونیٔ معاصی کا ہوا
افزوں ہیں اگر گنہ کرم افزوں ترا
دیکھا ہر طرح خوب سب کو جانچا

از کارِ جہاں عقدہ کشودم ہمہ را
در محنت و اندوہ ربودم ہمہ را
حق دانی و انصاف ندیدم ز کسے
دیدم ہمہ را و آزمودم ہمہ را

ترجمہ

دنیا کا ہر ایک عقدہ میں نے کھولا
مشکل میں کسی نے ساتھ میرا نہ دیا
حق دانی و انصاف کو پایا نہ کہیں
ہر طرح سب کو آزمایا دیکھا

رُباعیات

امجد حیدر آبادی

لب پر کس شخص کے دمِ سرد نہیں
کس کا چہرہ ہے آج، جو زرد نہیں
ہر شخص ہے دردمند فرداً فرداً
لیکن کوئی کسی کا ہمدرد نہیں

دُنیا کے ہر اک ذرّے سے گھبراتا ہوں
غم سامنے آتا ہے جدھر جاتا ہوں
رہتے ہوئے اس جہاں میں مدّت گزری
پھر بھی اپنے کو اجنبی پاتا ہوں

غزل

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین شیخ المشائخ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ ابو الحسن قربی قادری علیہ الرحمہ

نہ کی رہ میں ترکِ قدم گستاخ
بے قدم کے نہ مار دم گستاخ

لعل شیریں سوں کر شکر ریزی
ان کو تیرا کیا کرم گستاخ

دل کی تسخیر کوں سیاہ سرشک
لے چلیا آہ کا علم گستاخ

تو ان اللہ ہو انا الحق بول
عاشق اس قول میں ہے کم گستاخ

لائقِ اختفا ہے سرِّ قدم
کیوں چلے گا یہاں قدم گستاخ

عشق کی راہ ہے تمام آداب
قربی اس رہ میں نہیں ہم گستاخ

پیش کش : حضرت مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری شطاری المعروف بہ ہلال پاشاہ ۔ نائب ناظم دار العلوم لطیفیہ۔

افتتاحیہ

صحافت ایک وسیع اور ہمہ گیر لفظ ہے جو اپنے اندر علمی، دینی، تاریخی و اصلاحی اور ادبی و سماجی مفہوم رکھتا ہے اور یہ عربی زبان کا لفظ ہے "صحف" سے ماخوذ ہے۔ اسی سے صحیفہ کا لفظ بھی مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں وہ چیز جس پر لکھا جا سکے۔ صحیفہ کا لفظ انبیاء کرام کی الہامی تعلیمات اور احکامات کے مجموعہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور آج کل رسائل و جرائد اور اخبارات کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ عربی زبان کی معروف و مستند لغت "المنجد" کی تصریحات اس طرح ہیں: الصحافۃ، عالم الصحافۃ، الصحافی الذی اتخذ الصحافۃ مھنۃ لہ۔ یعنی اخبار نویسی، اخبار نویس لوگ صحافی وہ ہے جس نے صحافت کو اپنے لیے بطور پیشہ اختیار کیا ہو۔ انگریزی زبان میں صحافت کو جرنلزم JOURNALISM اور اس پیشہ سے وابستہ شخص کو جرنلسٹ JOURNALIST کہا جاتا ہے۔ صحافت کا ایک عام فہم اور سیدھا سادا مفہوم اور مطلب یہ ہے پیغامات اور معلومات کو سچائی و صفائی اور امانت و دیانت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا جائے۔ اس معنی و مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کا دینی و تاریخی پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ کے رسولوں اور پیغمبروں نے خدائی پیغامات و ہدایات اور احکامات و تعلیمات کو اپنی اپنی امتوں تک پہنچایا۔ پہلے سے یہ کام ابتداء میں زبانی حیثیت سے انجام پذیر ہوا ہو۔ پھر تحریر کے ذریعہ انجام پانے لگا ہو۔ سورۃ الاعلیٰ کی ان آیتوں سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ صحیفوں کے ذریعہ آسمانی پیغامات حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی آمد سے قبل بھی لوگوں تک پہنچ چکے تھے۔ ان ھذا لفی الصحف الاولی ٥ صحف ابراھیم وموسیٰ ٥ یہ بات بے شک ہے جس کا بیان پہلے کے صحیفوں میں ہے اور یہی بات ابراھیم وموسیٰ کے صحیفوں میں بھی تھی۔

انسانی تاریخ کے کس دور اور کس زمانے میں تحریر وجود پذیر ہوئی قطعی طور پر اس کا تعین مشکل ہے۔ البتہ حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ آپ فن تحریر کے موجد اور بانی تھے۔ جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ مصر میں تحریر کے چند ایسے نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن سے متعلق محققین کا قیاس ہے کہ یہ کتبے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین ہزار سال پہلے کے ہو سکتے ہیں۔

بہرکیف صحیفوں کا سلسلہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان کے لیے آسمانی ہدایات کا سلسلہ قائم ہوا اور

اس کا ایک تاریخی تسلسل قائم ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے : وقالوا لولا یاتینا بآیۃ من ربہ اولم تاتھم بینۃ ما فی الصحف الاولیٰ ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نبی اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی پیش کیوں نہیں کرتا۔ کیا ان کے پاس پہلی کتابوں میں صاف صاف نشانیاں اس کے پہلے نہیں آچکی تھیں ؟

آسمانی صحیفوں میں قرآن کریم ہی وہ صحیفہ ہے جس کے ذریعہ سے تحریری معلوم اور مستند تاریخ سامنے آتی ہے اور سب سے پہلے اسی کے ذریعہ قلم کی اہمیت اور افادیت اور اس کی وسعت وہمہ گیریت اجاگر ہوتی ہے۔ چناں چہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم وحی نازل ہونے کے بعد نہ صرف لوگوں کو سنا دیتے تھے۔ بلکہ اس کی تحریر اور ترتیب کا کام بھی حضرات صحابۂ کرام کے ذریعہ انجام دیا کرتے تھے۔ بعض صحابہ نے قرآن کریم کی کتابت کے ساتھ ساتھ حدیث کی تحریر اور تدوین بھی کی۔ جن میں ان تین صحابی کا نام سرفہرست ہے۔ چناں چہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے احادیث کا ایک مختصر مجموعہ مرتب کیا۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بھی چند حدیثوں کی تدوین فرمائی اور اس مجموعہ کا نام "الصحیفۃ الصادقۃ" رکھا اور حضرت ابوہریرہؓ احادیث کا املا فرماتے تھے اور کتابت بھی فرماتے تھے۔ اپنے شاگرد رشید ابوعقبہ ہمام بن منبہ کے لیے ایک مجموعہ "الصحیفۃ الصحیحۃ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیارس کی تحقیق اور نگرانی میں شائع ہوا ہے۔ عہد نبوت میں نہ صرف قرآن کی کتابت اور ترتیب ہوی۔ بلکہ حدیث کی کتابت اور تدوین کا کام بھی انجام پایا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قرآن کی باضابطہ جمع و تدوین فرمائی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں قرآن کی نقول تیار کی اور سارے عالم اسلامی میں پھیلادیا۔ پھر تیسری صدی ہجری میں باضابطہ حدیثوں کی جمع اور تدوین ہوی اور ان کی نقول تیار کی گئیں اور ایک مقام سے دوسرے مقام پہنچائی جاتی رہیں۔ پھر کتاب وسنّت سے مستنبط اور مربوط علوم وفنون کی اشاعت کا کام ہونے لگا۔ غرض کتاب وسنّت اور اس کے متعلقہ علوم کو مختلف علاقوں میں پھیلایا جانے والا یہ عمل اگرچہ کہ خالص دعوتی اور تبلیغی نوعیت کا حامل ہے۔ تاہم اس عمل میں صحافت کی ہلکی سی شان موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تعلیمات کو صدق وامانت کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچانا۔

صحافت کا عمومی اطلاق واقعات نگاری اور اخبار نویسی ہی پر ہوتا ہے اور یہ عمل زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اور اس کی قدیم ترین کڑی، اخلاقی تعلیمات، مذہبی ہدایات اور سرکاری احکامات سے جڑی ہوی نظر آتی ہے۔ چناں چہ قدیم زمانہ میں احکامات وہدایات اور بادشاہوں کے فرامین وغیرہ پتھر کی پتلی تختیوں اور تانبے کی پلیٹوں پر لکھ کر لوگوں تک پہنچائے جاتے تھے۔ پھر زمانے نے ترقی کی تو اخبار وقوانین اور احکام کو پبلک مقامات پر پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔ پھر قلمی مسودات اور ان کی نقلوں کے ذریعہ اخبار رسانی کا کام انجام دیا جاتا تھا۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے روم راج میں ایک قلمی خبرنامہ جاری کیا جاتا تھا جس میں سرکاری اطلاعات اور نیز میدان جنگ کی خبریں بھی ہوتی تھیں۔ اور قدیم ہندوستان میں منو مہاراج کے دور میں اخباروں کی فراہمی اور خبررسانی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں خبریں منتقل ہوتی تھیں۔

پھر کاغذ کی فراہمی اور پرنٹنگ Printing کی سہولتوں سے اخبارات کی اشاعت میں وسعت پیدا ہوئی، پھر الیکٹرانک دور کا آغاز ہوا تو اخبارات کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب آگیا اور ان کی اشاعت میں برق رفتاری آگئی اور ہر ملک کے عوام اپنے گردوپیش کے حالات اور واقعات سے باخبر ہونے لگے۔

پھر بیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے پوری طرح سر اٹھایا تو ساری دنیا میں نئی نئی ایجادات ہوئیں جن سے صحافت میں بھی تبدیلیاں اور ترقیاں ہونے لگیں۔ اور آج ساری دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں روزنامے، ہفتہ واری، ماہ واری، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل وجرائد شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں سیاسی، علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی، طبی، سائنسی، ٹیکنالوجی، سیاحتی اور تفریحی مضامین چھپ رہے ہیں اور ہر قسم کا ذوق ورجحان رکھنے والوں کے لیے اچھا خاصا سامان فراہم ہے۔ ان کے علاوہ پوسٹر Posters، ہینڈ بلس Hand Bills، اسٹیکرز Stickers اور ٹی بورڈز T. BOARDS کا بھی ایک سلسلہ چل پڑا ہے، جن کے ذریعہ ہر علاقہ اور ہر طبقہ کے لوگوں تک ہر قسم کا پیغام پہنچ رہا ہے۔

ٹیلی ویژن، انٹرنٹ Television & Internet کی ایجاد نے تو صحافت کو زمین سے آسمان کر دیا ہے۔ کل تک اخبارات ورسائل طباعت Printed تک محدود تھے لیکن آج انٹرنٹ کی بدولت دور دراز ملکوں کے اخبارات، پیغامات، مجلّات اور کتابوں کے صفحات ہماری نگاہوں کے سامنے کھلے پڑے ہیں اور اپنی ہی جگہ بیٹھے بیٹھے ان کے صفحات سے اخذ ونقل کی سہولت تک حاصل ہو گئی ہے۔ ٹیلی ویژن کے ذریعہ نہ صرف ساری دنیا کی خبریں سنی جا رہی ہیں بلکہ بر وبحر اور فضا میں رونما ہونے والے واقعات کی تصویریں بھی دیکھی جا رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ دنیا مختلف افراد پر مشتمل ایک خاندان کی شکل اختیار کر گئی ہے اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے دنیا کے ہر ملک اور ہر قوم کی تہذیب وثقافت، زبان وادب، مذہب اور ماحول پر اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور یہ اثرات مفید ومضر، مثبت اور منفی دونوں پہلو لیے ہوئے ہے۔ اور ان کو اچھی طرح سے محسوس کیا جا رہا ہے۔

قوموں کی تعمیر وتشکیل اور ترقی میں صحافت ہمیشہ سے اہم کردار ادا کرتے آرہی ہے۔ برصغیر ہند وپاک میں صحافت کا آغاز سترہویں صدی میں ہوا اور یہاں پہلے پہل انگریزی، بنگالی، فارسی اخبارات شائع ہونے لگے۔ پھر 1822ء میں منشی سدا سکھ نے کلکتہ سے اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" جاری کیا۔

اس زمانہ میں مسلمانوں کی اکثریت اردو صحافت سے جڑی رہی۔ اردو صحافت نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اس میں انگریزوں کے خلاف نفرت وعداوت اور جہاد کا غلغلہ تھا اور ان کی زبان وادب اور ان کے علم وفن سے بھی بے تعلقی اور دوری کی فضا چھائی ہوئی تھی اسی لیے اردو صحافت اس وقت انقلابی مسائل کے ارد گرد گھومتی رہی۔ پھر سرسید احمد خان نے اپنے اخبار "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ مسلمانوں کو علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی جانب مائل کیا۔ اور قوم کے سامنے تعمیر وترقی کی شاہ راہ کھول دی۔ جس کی وجہ سے آج مسلمانوں نے جدید علوم وفنون اور جدید صحافت کی دُنیا میں قدم رکھا۔

آج پریس Press اور میڈیا Media کی ضرورت واہمیت کافی بڑھ چکی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے

کہ کس طرح اس کے مفید پہلوؤں کو اختیار کیا جائے اور کس طرح اس کے مضر گوشوں سے اجتناب کیا جائے اور کس طرح مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں اور اسلام کی دعوت و تبلیغ میں استعمال کیا جائے۔ ان پہلوؤں پر غور و فکر کی سخت ضرورت ہے۔ اس باب میں بھی خذ ما صفا دع ما کدر [اچھی چیز لے لو اور بری چیز چھوڑ دو] کے اصول پر کاربند رہنا ہی صحیح اور معتدل روش معلوم ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں صحافت کا قافلہ جس راہ پر رواں دواں ہے وہ اہلِ فکر و نظر کی نگاہوں سے مستور نہیں ہے اور یہ تلخ حقیقت ہے کہ آج کی صحافت دروغ گوئی، الزام تراشی، بہتان آرائی، بے حیائی، فحاشی، عریانی، بے احترامی، ناانصافی، سفاکی، غیر اخلاقی اعمال و افعال اور غیر انسانی حرکات و سکنات کی منہ بولتی تصویر ہے اور اس صورتِ حال کے باعث ہر ملک اور ہر قوم کی تہذیب و معاشرت، سیرت و کردار اور اخلاق بری طرح متاثر ہو رہے ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں تعمیر کا پہلو مغلوب اور تخریب کا پہلو غالب ہوتے جا رہا ہے۔ لہذا وقت کا اہم ترین تقاضہ یہ ہے کہ صحافت کو شر و فساد اور ناانصافی و برائی کے انسداد کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور دشنام طرازی و فحش گوئی، الزام تراشی و دروغ گوئی اور عریانی و فحاشی کے سارے وسائل کی روک تھام کے لیے استعمال کیا جائے اور غیر اخلاقی و فتنہ انگیز تحریروں اور تصویروں کی اشاعت سے احتراز کیا جائے۔

اور صحافت کے ذریعہ خیر و فلاح اور نیکی و بھلائی اور علم و ادب کو فروغ دیا جائے۔ اور اس کے ذریعہ سے صالح اور انسانیت نواز اقدار کی روشنی میں افراد اور اشخاص کی ذہنی تربیت کی جائے۔ اور ایک صالح معاشرہ اور نیک سماج کو وجود میں لانے کی ہر ممکن جد و جہد کی جائے۔

اور رائے کی آزادی و حق گوئی اور راست بازی کی فضا پیدا کی جائے۔

اگر ان خطوط پر صحافت کا سفر جاری رہا تو اس کے مفید نتائج بھی سامنے آ سکتے ہیں اور اشاعتِ اسلام کے لیے بھی راہیں خود بخود ہموار ہو سکتی ہیں۔

وما علینا الا البلاغ۔



روئدادِ دارالعلوم لطیفیہ

اسلام آخری اور ابدی دین ہے اور اب کسی پیغمبر اور کسی کتاب کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات پر نبوت کی تکمیل ہو چکی ہے۔ لیکن کارِ نبوت قیامت تک چلتا رہے گا اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے نائبین اس کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ اس عظیم کام کی انجام دہی کے لیے مدارسِ عربیہ ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ جن کی کوکھ سے ہزاروں علماء و فضلاء نکل رہے ہیں جو اپنی تقریری، تحریری اور تدریسی اور تذکیری خدمات کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں مصروفِ عمل ہیں۔ دارالعلوم لطیفیہ بھی تقریباً تین سو سال سے اپنی کارکردگی کو بحسن و خوبی جاری رکھے ہوئے ہے اور موجودہ ناظمین حضرات اور اساتذہ کرام اس چمنستانِ علم کی آبیاری میں مشغول ہیں۔

آغازِ سالِ نو

مورخہ ۱۱ر شوال المکرم ۱۴۲۱ھ سے دارالعلوم کا نیا تعلیمی سال شروع ہوا۔ حسبِ عادت اس سال بھی اکثر طلباء کا داخلہ ہوا۔ ہندوستان کے بیشتر علاقوں سے طلباء کا داخلہ عمل میں آیا۔

افتتاحی اجلاس

انجمن دائرۃ المعارف کا افتتاحی اجلاس امسال بھی مورخہ ۸ر ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۱ھ مطابق 3ر فروری 2001ء روز شنبہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت عالی جناب ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان صاحب قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے فرمائی۔ جس میں علم دوست حضرات کو بحیثیت خصوصی مہمان مدعو کیا گیا۔ اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا مولوی امتیاز احمد صاحب رشادی، ناظم دارالعلوم الرشید نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تقریر آج دنیا کے لیے بہت ضروری ہے اس کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ہے ہمّت اور دوسرا مواد۔ ان دونوں پر جو قابو پالیتا ہے وہ اچھا مقرر کہلاتا ہے۔ موصوف کی تقریر کے بعد ناظم دارالعلوم نے طلباء سے خطاب فرمایا۔ اور انھیں تقریر و تحریر پر عبور پیدا کرنے کی صلاح دی اور انھیں کی دعاؤں سے یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

دورۂ حدیث کا آغاز

اس سال مورخہ ۲۳ر شوال المکرم ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۱ر ماہِ جنوری ۲۰۰۱ء بروز جمعرات صبح ٹھیک ۱۱ بجے دارالعلوم لطیفیہ کے وسیع و عریض ہال میں [illegible]

آغاز کی ایک مختصر تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت عالی جناب ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان قادری صاحب ناظم دارالعلوم لطیفیہ نے فرمائی اور اساتذۂ کرام نے دورۂ حدیث کا آغاز فرمایا اور یہ مبارک و مسعود محفل حضرت اقدس ناظمِ موصوف کی دعاؤں سے اختتام پذیر ہوئی۔

اسبابِ صحت

دارالعلوم میں تعلیم و تدریس، تقریر و تحریر کے ساتھ ساتھ دماغی فرحت و جسمانی راحت کے اسباب بھی مہیّا ہیں۔ چناں چہ روزانہ شام کے وقت تعلیم سے فارغ ہوکر والی بال، فٹ بال، کرکٹ وغیرہ مختلف گیمس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

نویدِ مسرت

بحمد اللہ! امسال بھی مدراس یونیورسٹی کے امتحانات، افضل العلماء، ادیبِ فاضل کے ڈگری کورس میں اکثر طلباء نے شرکت کی اور انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

امتحانات

اس سال بھی طلباء نے ششماہی امتحانات مورخہ یکم ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ مطابق 23 مارچ 2001ء رکھا۔ یہ امتحانات ہفتہ بھر اساتذۂ کرام کی زیرِ نگرانی ہوتے رہے۔ اور سالانہ امتحانات ۲۵ رماہِ رجب المرجب ۱۴۲۲ھ مطابق 13 ماہ اکتوبر کو شروع ہوا۔ اور ہفتہ بھر جاری رہا۔

عباپوشی و اعطائے اسناد

دارالعلوم کا سالانہ اجلاس مورخہ ۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ مطابق 28 ر اکتوبر 2001ء روز اتوار بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت، ناظم دارالعلوم لطیفیہ، فضیلت مآب ڈاکٹر مولانا سید شاہ عثمان قادری صاحب، مدظلہ العالی نے فرمائی اور خود اپنے دستِ فیض اقدس سے فارغین کو عباپوشی اور اسناد عطا فرمایا۔ نیز اس اجلاس میں مقامی اور بیرونی علمائے کرام اور حکمائے عظام اور مقتدر علم دوست حضرات کثیر تعداد میں شریک تھے اور حاضرین علمائے کرام کی تقاریر سے محظوظ ہوئے۔

تقسیم انعامات

اسی دن شام میں ایک دوسری نشست ہوئی جس میں درسیات و مقالہ نویسی، مقابلۂ تحریر و تقریر اور گیمس و اسپورٹس میں اوّل و دوم آنے والے طلباء و عہدیداروں کو اُن کی خدمات کے صلے میں قیمتی انعامات سے نوازا گیا۔

ہدیۂ تشکر

ادارہ ان تمام حکیموں و ڈاکٹروں کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے ہمارے طلباء و اساتذۂ کرام کی صحت کا بھرپور خیال فرمایا اور ادویات و مشوروں سے نوازا۔ نیز ادارہ ان تمام مدیران اخبار کا تہہ دل سے مشکور ہے جنھوں نے دارالعلوم کی تمام کارروائیوں کو بروقت شائع فرمایا۔ بالخصوص ادارہ عالی جناب کاتب محمد شریف صاحب باکاتی آمبوری، عالی جناب سید علیم الدین علیم صبا نویدی صاحب مدراس کا بے حد ممنون و مشکور ہے جنھوں نے سالنامۂ اللطیف کی کتابت و طباعت کا کام بڑے خلوص و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر و سعادتِ دارین نصیب فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم



جواہر القرآن

تفسیر سورۃ النصر

مولانا مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

سورۃ النصر کے مدنی ہونے میں سارے مفسرین کا اتفاق ہے۔ یہ سورۃ ایک رکوع، تین آیات، سترہ کلمات اور ستتھتر حروف پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام سورۃ التودیع بھی ہے۔ تودیع کے معنی کسی کو وداع کرنے کے ہیں۔ اس نام کی مناسبت یہ ہے کہ اس سورۃ کے ذریعہ یہ اشارہ دیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عنقریب دُنیا سے پردہ فرمانے والے ہیں۔ اور خود آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سورۃ کے نزول سے محسوس کرلیا تھا کہ اجل موعود قریب ہے۔ اکثر و بیشتر صحابہ کرام کا اتفاق ہے کہ یہ سورۃ طیبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پر دلالت کرتی ہے۔ ان حضرات نے دو پہلو سے یہ مفہوم اخذ کیا۔ ایک پہلو یہ تھا کہ یہ سورۃ نازل ہونے کے بعد آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا۔ جس میں یہ صراحت فرمائی کہ اللہ نے ایک بندے کو دنیا میں رہنے یا ربِّ کریم سے ملاقات کرنے کے بارے میں اختیار دیا ہے لیکن اس بندے نے دُنیا میں رہنے کی بجائے اللہ تعالےٰ سے ملاقات کو پسند کیا۔

یہ ارشادِ مبارک سُن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہٗ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگے اور فرمایا: فدیناك بانفسنا واموالنا وآبائنا واولادنا: آپ پر ہماری جانیں، ہمارے مال، ہمارے آباء اور ہماری اولاد سب قربان۔

دوسرا پہلو یہ تھا کہ صحابہ کرام نے اس سورۃ کے داخلی مضمون سے بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ہونے کا اندازہ کرلیا۔ کیوں کہ فتح و نصرت کا حاصل ہونا اور اسلام کا غلبہ ہونا، دین کے مکمل ہونے کی علامت ہے اور جب قرآن مکمل ہوچکا تو دنیا میں صاحبِ قرآن کی چنداں ضرورت باقی نہ رہی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہٗ کی روایت ہے جسے امام بیہقی نے نقل ہے: لمّا نزلت اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح دعا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فاطمۃ - وقال انہ قد نعیت الیّ نفسی فبکت ثم ضحکت و قالت اخبرنی انہ نعیت الیہ نفسہ فبکیت ثم قال اصبری فانك اوّل اھلی لحوقًابی فضحکت۔

سورۂ نصر نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بتول رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فرمایا: مجھے میری وفات کی خبر دی گئی ہے تو وہ رو پڑیں پھر مسکرا اٹھیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے میری وفات کی اطلاع دی گئی ہے تو میں رو پڑی پھر آپ نے فرمایا: صبر کرو میرے اہل بیت میں سب سے پہلے مجھ سے آکر ملو گی تو میں خوش ہو گئی۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت ہے۔ جسے امام بخاری نے اس طرح روایت کیا ہے۔

«عن ابن عباس قال کان عمر یدخلنی مع اشیاخ بدر فکان بعضهم وجد فی نفسه فقال لم یدخل هذا معنا ولنا ابناء مثله فقال انه ممن قد علمتم فدعاهم ذات یوم فادخلنی معهم فما رأیت انه دعانی فیهم یومئذ الا لیریهم فقال ما تقولون فی قول الله عزوجل اذا جاء نصر الله والفتح فقال بعضهم امرنا ان نحمد الله ونستغفره اذا نصرنا وفتح علینا وسکت بعضهم فلم یقل شیئاً فقال لی ۔ اکذلک تقول یا ابن عباس، فقلت لا۔ فقال ما تقول فقلت هو اجل رسول الله صلی الله علیه وسلم اعلمه له قال اذا جاء نصر الله والفتح فذلك علامة اجلك فسبح بحمد ربك واستغفره انه کان توابا۔ فقال عمر ابن الخطاب لا اعلم منها الا ما تقول۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی مجلس میں غزوۂ بدر کے بزرگوں کے ساتھ مجھے بلاتے تھے۔ بعض بزرگوں کو مجھ جیسے نوعمر لڑکے کا ان کے ساتھ شریک مجلس رہنا ناگوار لگا اور انھوں نے کہا یہ حضرت عمر کے پاس ہمارے ساتھ کیوں جاتے ہیں ان کی عمر کے تو ہمارے لڑکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا: تم جانتے ہی ہو کہ علم اور تفقہ فی الدین میں ان کا مقام کیا ہے۔ پھر ایک روز حضرت عمر نے اپنی مجلس میں ان بزرگوں کے ساتھ مجھے بھی اس لیے بلا لیا تا کہ انھیں دکھائیں کہ میں کون ہوں اور مجھے ان کے ساتھ بلانے کی وجہ کیا ہے؟ پھر حضرت عمر نے ان بزرگوں سے پوچھا آپ حضرات اذا جاء نصر اللہ والفتح کے سلسلہ میں کیا کہتے ہیں؟ ان میں سے بعض بزرگوں نے کہا اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ جب اس مدد آ پہنچے اور فتح نصیب ہو تو ہم اللہ کی حمد و ثنا کریں۔ اس سے توبہ و استغفار کریں۔ بعض بزرگوں نے خاموشی اختیار کی اور کچھ نہیں کہا۔ حضرت عمر نے مجھ سے پوچھا: اے ابن عباس کیا تم بھی یہی کہتے ہو۔ میں نے عرض کیا: نہیں! انھوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ آپ کی رحلت کا وقت قریب آچکا ہے۔ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے تو یہ آپ کی وفات کے قریب کی نشانی ہے۔ بس آپ اپنے رب کی تحمید و تقدیس بیان کرو اور استغفار کرو۔ بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان آیات کے بارے میں بھی وہی جانتا ہوں جو تم کہتے ہو۔

امام بخاری علیہ الرحمہ کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارکہ کے آخری ایام میں بکثرت یہ کلمات پڑھا کرتے تھے: سبحانك اللهم وبحمدك واستغفرك واتوب

الیك سبحان اللہ وبحمدہ استغفراللہ واتوب الیہ: میں نے ان کلمات کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: میرے لیے ایک علامت مقرر کی گئی ہے کہ جب بھی اسے دیکھوں تو یہ کلمات پڑھا کروں اور وہ یہ ہے: اذا جاء نصر اللہ والفتح۔

امام بخاری کی ایک اور روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ سورۂ نصر نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا بھی پڑھتے تھے: سبحٰنك ربنا وبحمدك اللّٰھم اغفرلی۔

ام سلمہؓ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نصر نازل ہونے کے بعد بکثرت یہ دعا پڑھنے لگے: سبحٰنك اللّٰھم وبحمدك اللّٰھم اغفرلی سبحٰنك ربنا وبحمدك اللّٰھم اغفرلی انك انت التواب الغفور۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے صراحت کی ہے کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت و ریاضت میں بڑا مجاہدہ فرمایا، یہاں تک کہ قدم مبارک متورم ہو گئے تھے۔

مذکورۃ الصدر روایتوں میں دعا و استغفار کے مختلف کلمات ہیں جو مختلف حالات میں زبانِ نبوت سے صدور پذیر ہوئے ہیں اور مختلف راویوں نے جن فقرات کو سنا انہیں من وعن روایت کیا ہے اور ان کلمات میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ تحمید و تسبیح اور توبہ و استغفار کے مختلف اسالیب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گناہوں سے معصوم رہنے کے باوجود اس قدر کثرت سے دعا و استغفار اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو جانا یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ہر صاحبِ ایمان کو جب اپنی موت کا وقت قریب معلوم ہو جائے تو کثرت سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو تسبیح و تحمید اور توبہ و استغفار کی ہدایت دینے کا ایک مقصد اور منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل امت کے لیے سنت قرار پائے اور آنے والی نسلیں اس اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل عرصہ تک کفار و مشرکین کے ظلم و ستم کے باعث رنج و تعب اور مشقت و تکلیف سے دو چار رہے اور ایک طویل کشمکش اور جہدِ مسلسل کے بعد فتح مبین سے ہم کنار ہوئے۔ ایسے پر مسرت موقعہ پر آپ نے اپنے قلبِ مبارک پر رفعت و عظمت کے احساسات و جذبات کو ابھرنے نہیں دیا۔ اسی کا اثر تھا کہ جب فتح مکہ کے موقعہ پر جب آپ شہر قدس میں داخل ہوئے تو سر مبارک جھکا ہوا تھا اور زبان مبارک پر حمد و شکر کے کلمات جاری تھے اور ہر زاویہ اور ہر پہلو سے اللہ کی عظمت و کبریائی کا اظہار ہو رہا تھا۔ فخر کے عوض عجز اور انتقام کے بدلے عفو کی شان نمایاں تھی اور جب حیاتِ ظاہری اپنے اختتام کی منزل پر قدم رکھنے لگی تو حمد باری اور شکر الٰہی میں کمی کے احساس سے آپ نے توبہ و استغفار کے عمل کو تیز تر کر دیا۔

سورۃ النصر کے زمانۂ نزول سے متعلق بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سورۃ ۹ ذی الحجہ ۱۰ سنہ ہجری کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوی اور عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ سورۂ نصر قرآن کریم کی آخری سورت ہے۔ یعنی اس کے بعد نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کوئی مکمل سورت نازل نہیں ہوی۔ سورۂ نصر قرآن کی آخری سورت ہونے کے بارے میں سارے مفسرین کا اتفاق ہے۔ البتہ قرآن کریم کی آخری آیت کون سی ہے۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ سورۂ نصر کے نازل ہونے کے بعد نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم تین ماہ حیات رہے اور اس مدت میں مختلف آیتیں نازل ہوی ہیں۔ اس سلسلہ میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعضوں نے یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکللۃ کو آخری آیت کہا ہے اور بعض کے نزدیک الیوم اکملت لکم دینکم آخری آیت اور بعض کے نزدیک آیت ربوٰ (بقرہ رکوع ۳۔ آیت ۳۸ ویں اور سورۂ توبہ (۱۲۸-۱۲۹) آخری آیت ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر کا بیان ہے: سورۂ نصر حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوی اس کے بعد سورۂ مائدہ کی آیت الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوی۔ ان دونوں کے نزول کے بعد نبئ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں صرف اسّی ۸۰ دن رہے۔ ان دونوں کے بعد آیت کلالہ نازل ہوی۔ جس کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے کل پچاس دن رہ گئے تھے۔ اس کے بعد آیت لقد جاءکم رسول من انفسکم نازل ہوی جس کے بعد عمر شریف کے پینتیس ۳۵ دن باقی تھے۔ اس کے بعد آیت واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ نازل ہوی۔ جس کے بعد صرف اکیس ۲۱ دن اور مقاتل کی روایت میں صرف سات روز کے بعد وفات ہوگئی۔ جیسا کہ یہ تفصیل صاحبِ معارف القرآن نے بیان کی ہے:

سورۂ نصر کے نزول سے متعلق بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے قبل یا اس کے بعد نازل ہوی ہے اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ آیت میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ مکۃ المکرمۃ کی عظیم الشان فتح، ہجرت کے آٹھویں سال رمضان شریف میں ہوی۔ اس کے بعد نبئ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وحئ الٰہی کی اس پیش گوئی (یدخلون فی دین اللہ افواجًا) کو پوری ہوتے ہوے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے اور ہجرت کا دسواں سال مکمل ہوتے ہوتے سارے جزیرۃ العرب پر اسلام چھا گیا۔ امام بخاری نے عمرو بن سلمہ کی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو عرب کے تمام قبائل حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب دوڑ پڑے اور یہ سب فتح مکہ کے منتظر تھے۔ اور کہا کرتے تھے محمد کو اپنی قوم سے مقابلہ کرنے دو۔ اگر انھوں نے قوم پر غلبہ پالیا تو وہ یقیناً نبی ہیں۔

اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریف ربیع الاول ۱۱ سنہ ہجری میں ہوی۔ اس اعتبار سے اس سورۃ کا نزول رحلت سے تقریباً ڈھائی سال قبل ہوا اور ایک دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وفات شریف سے چھ ماہ قبل رمضان شریف سے پہلے یہ سورۃ نازل ہوی۔ اس کے نازل ہونے کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادات

ریاضات میں اضافہ فرمایا۔ گویا سفرِ آخرت کی تیاری شروع فرمادی۔ چناں چہ اس سال رمضان شریف میں آپ نے بیس ۲۰ دن کا اعتکاف فرمایا۔ حالاں کہ آپ ہر رمضان میں دس روز کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ اس تبدیلی اور زیادتی کو دیکھ کر صاحب زادی بتول رضی اللہ عنہا نے پوچھ ہی دیا تو ارشاد فرمایا: لختِ جگر! مجھے اپنی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔

حاصل کلام!

سورۂ نصر قرآن کریم کی ایک چھوٹی سی صورت ہے جو براہِ راست رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو فتح مبین اور غلبۂ اسلام کی بشارت سنا رہی ہے۔ اور آپ کو تسبیح و استغفار کی ہدایت دے رہی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ سورت اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ اہل ایمان کے لیے بڑی آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنے کے بعد فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اکیس ۲۱ سالہ جد وجہد کے بعد فتح مبین حاصل ہوی۔ اور یہ سورت یہ پیغام بھی دے رہی ہے کہ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا جو کردار اور عمل رہا وہی نمونہ اہلِ ایمان کو بھی اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور فتح و نصرت کے وقت پیش کرنا ہے اور وہ بھی اپنے رسولِ محترم کی طرح نصرتِ خداوندی کی آمد اور فتح حاصل ہونے کے وقت سرتاپا اللہ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور ان کامیابیوں اور کامرانیوں کو اللہ تعالٰے کا فضل تصوّر کریں اور اپنی ذات اور اپنی کوششوں کی طرف دھیان اور توجہ نہ دیں بلکہ اللہ تعالٰے کی تسبیح و تحمید سے ذہن و قلب کو معمور رکھیں اور زبان کو توبہ و استغفار سے تر رکھیں۔

سورۃ نصر سے متعلق مذکورہ تشریحات اور توضیحات کے بعد اس کا مفہوم خیز ترجمہ ملاحظہ کیجیے:

" جب اللہ کی نصرت آپہنچے اور مکۃ المکرمۃ فتح ہو جاے۔ اور آپ یہ دیکھیں کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے رب کی تسبیح پڑھیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

واٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٭٭

بقیہ صفحہ 97 کا : نقوشِ طاہر" عقل و دانش اور علم و حکمت کے شاہکار"

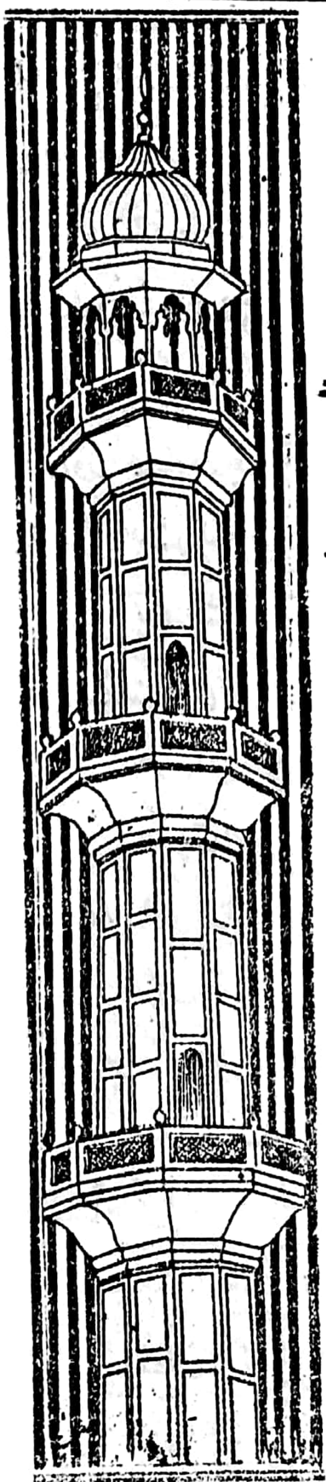
اور انھیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوگئی۔ ؎

موجِ دریا سے یہ کہتا ہے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اللھمّ ھدایۃ الحق والصّواب وما علینا الا البلاغ ٭

جواہر الحدیث

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق قریشی قادری ایم ۔ اے؛



قسط دوم

عن جابر قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اذا قام احدکم یصلی من اللیل فلیستک فان احدکم اذا قرأ فی صلاتہ وضع ملک فاہ علی فیہ ولا یخرج من فیہ شیئ الا دخل فم الملک۔ (البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ مسواک کرے۔ کیوں کہ جب وہ قرأت کرتا ہے تو فرشتہ اس کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیتا ہے۔

اس حدیث میں مسواک کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اگر نمازی کے منہ میں کھانے کی کوئی چیز رہ گئی ہو تو اس کی بدبو اور تعفن سے فرشتہ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے نماز پڑھنے سے قبل مسواک کے ذریعہ دانتوں اور منہ کو خوب صاف کر لینی چاہیے۔ تاکہ نہ صرف فرشتہ بلکہ انسان کو بھی ایذا نہ پہنچے۔ جیساکہ عمرو بن عوف مزنی فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الاصابع تجزی مجری السواک اذا لم یکن سواک۔ یہ حکم صرف اس صورت حال میں ہے جب کہ مسواک نہ ملے ورنہ مسواک کی موجودگی میں انگلی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

عن علی رضی اللہ عنہ ان افواھکم طرق القرآن فطھروھا بالسواک۔ (ابن ماجہ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہارے منہ قرآن کے راستے ہیں لہٰذا ان کی صفائی مسواک سے کرو۔

عن ابی الدرداء قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ثلٰث من اخلاق المرسلین تعجیل الفطر وتاخیر السحور والسواک (رواہ الطبرانی فی معجمہ)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ محترم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسولوں کے اخلاق اور عادات۔—

میں سے تین چیزیں ہیں۔ ان میں سے ایک افطار میں جلدی کی جائے اور دوسری سحری میں تاخیر کی جائے اور تیسری مسواک کا استعمال کیا جائے۔

اغسلوا ثیابکم وخذوا من شعورکم واستاکوا وتزینوا فان بنی اسرائیل لم یکونوا یفعلون ذلک فزنت نساؤھم ۔ (جامع الصغیر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم اپنے لباس کو عمدہ نفیس اور پاک وصاف رکھو اور اپنے بالوں کی اصلاح کرو اور کنگھی کے ذریعہ درست رکھو اور مسواک کرو۔ بنی اسرائیل ان چیزوں کا خیال نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی عورتیں بدکاری میں مبتلا ہو گئیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مردوں کو بھی اپنی صورتوں کی صفائی، اپنے بالوں کی درستگی اور اپنے کپڑوں کی صفائی اور مسواک کے ذریعہ اپنے منہ کی پاکی اور خوش بو وغیرہ کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ ان کی بیویاں ان کی جانب مائل اور راغب اور متوجہ رہ سکیں۔

عن ابی ھریرۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا ینام لیلۃً ولا یتنبہ الا استنّ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سونے سے قبل اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسواک ضرور فرماتے اور لوگوں سے بھی فرماتے تھے کہ تم لوگ سونے سے قبل مسواک کر لیا کرو۔ حضرت ابوہریرہ کا یہ بیان بھی ہے کہ جس وقت میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسواک کی تاکید کرتے ہوئے سنا اس وقت سے میرا یہ معمول بن گیا کہ میں سونے سے پہلے اور نیند سے اٹھنے کے بعد اور کھانے کے بعد مسواک کرتا ہوں۔

عن العامری کانوا یدخلون علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال تدخلون علیَّ قلحا استاکوا ۔ (طبرانی)

حضرت عامری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک موقعہ پر چند اشخاص بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے جن کے دانت زرد تھے تو آپ ﷺ نے اُن سے کہہ دیا: تم لوگ مجھ سے ملنے آتے ہو، تمہیں چاہیے کہ مسواک کر لیا کریں۔

اس حدیث سے ایک معاشرتی وتہذیبی اور اخلاقی پہلو یہ نمایاں ہوتا ہے کہ آدمی کو مجالس میں جانے سے پہلے مسواک کے ذریعہ منہ کی صفائی اور پاک وصاف کپڑوں اور خوشبو وغیرہ کا بھی اہتمام کرنا چاہیے تاکہ کسی کو لباس کی گندگی اور منہ کی بدبو وغیرہ سے کراہت اور تکلیف نہ ہو اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان امور کا خیال نہ صرف حضر بلکہ سفر میں بھی رکھا کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ریش مبارک میں کنگھی کرتے تو آئینہ دیکھتے۔ حضرت ام الدرداء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر کی تیاری سے متعلق پوچھا تو ام المومنین نے جواب دیا: میں توشہ کے ساتھ تیل، کنگھی، آئینہ، قینچی، سرمہ دانی اور مسواک رکھا کرتی تھی: کنت ازودہ خازودۃ دھنًا ومشطًا ومرأۃً ومقصًا ومکحلۃ ومسواکًا ۔ (مجمع)

مختلف احادیث میں جمعہ سے متعلق متعدد احکام ملتے ہیں جن کے اندر بھی مسواک کی ہدایت کے علاوہ اخلاق اور طہارت کی تعلیم موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ھذا یوم جعلہ اللہ تعالیٰ عید المسلمین فاغتسلوا ومن کان عندہ طیب فلا یضرہ ان یمس منہ وعلیکم بالسواک۔ (مؤطا امام محمد)

اللہ نے تمہارے لیے جمعہ کو عید کا دن قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس روز غسل کرو۔ خوشبو استعمال کرو اور مسواک ضرور کرو۔

من اغتسل یوم الجمعۃ واستنّ ومس طیبًا ان کان عندہ ولبس من احسن ثیابہ ثم خرج حتی یاتی المسجد فلم یتخط رقاب الناس ثم رکع ما شاء اللہ ان یرکع وانصت اذا خرج الامام کانت کفارۃ لما بینھا وبین الجمعۃ التی قبلھا۔

جس نے جمعہ کے دن غسل کیا اور مسواک کیا اور خوشبو استعمال کیا اور پاک وصاف اور عمدہ لباس پہنا۔ پھر مسجد چلا آیا اور لوگوں کی گردنوں سے پھلانگ کر آگے کی صفوں میں نہیں پہنچا اور نماز پڑھا اور امام کے آنے کے بعد خاموشی کے ساتھ خطبہ سنا تو اللہ تعالےٰ اس کے ہفتہ بھر کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ (شرح معانی الآثار)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کو اپنے معمولات میں غیر معمولی اہمیت بخشی ہے۔ حتیٰ کہ جان کنی کے عالم میں بھی مسواک استعمال فرمایا۔ تاکہ امت اس واقعہ سے سبق حاصل کرے کہ کسی کو اپنی موت کا علم اور یقین ہو جائے تو مسواک کر لے اور اللہ کے حضور سراپا نظیف پہنچے۔

امام بخاری کی درج کردہ حدیث ملاحظہ کیجیے:

عن عائشہ قالت ان من نعم اللہ علیّ ان رسول اللہ علیہ وسلم توفی فی بیتی ولیومی وبین سحری ونحری وان اللہ جمع بین ریقی وریقہ عند موتہ۔ دخل عبدالرحمٰن بن ابی بکر وبیدہ مسواک وانا مسندۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرأیتہ ینظر الیہ وعرفت انہ یحب السواک فقلت آخذہ لک فاشار براسہ ان نعم۔ فتناولتہ فاشتدّ علیہ۔ وقلت الینہ لک فاشار برأسہ ان نعم۔ فلینتہ فامرہ بین یدیہ رکوۃ فیھا ماء فجعل یدخل یدیہ فی الماء فیمسح بھما وجھہ ویقول لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات ثم نصب یدہ وجعل یقول اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ حتّٰی قبض ومالت یدہ۔ (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھ پر اللہ تعالےٰ کے انعامات اور اعزازات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات میری باری کے روز میری گود میں اور میرے حجرہ میں ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے مبارک لعاب دہن کو میرے تھوک کے ساتھ جمع کر دیا اور وہ یوں کہ میرے بھائی عبدالرحمان آئے تو ان کے ہاتھ میں مسواک تھی اور میں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دے رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسواک کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ اور مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ آپ مسواک کو بہت ہی محبوب رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ سے عرض کیا: کیا آپ کے لیے مسواک لے لوں؟ آپ نے سر مبارک ہلایا کہ ہاں، چنانچہ میں نے عبدالرحمٰن سے مسواک لے لی اور آپ کو دے دی۔ لیکن مسواک سخت ہونے کی وجہ سے آپ استعمال نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر میں نے عرض کیا: کیا میں مسواک کو نرم کر دوں؟ آپ نے سر مبارک کے اشارہ سے فرمایا: ہاں۔ چنانچہ میں نے اپنے دانتوں سے مسواک کو چبا کر خوب نرم کر دیا۔ پھر آپ کو دے دی تو آپ نے اپنے دانتوں پر پھیرا۔

آپ کے پہلو میں پانی سے لبریز ایک کٹورا تھا جس میں آپ اپنے ہاتھ ڈالتے اور چہرۂ انور پر پھیر لیتے تھے۔ اور فرماتے لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے شک موت کے لیے بڑی سختیاں ہیں۔ پھر آپ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور اس وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہو گئے: اللھم الرفیق الاعلیٰ: اے اللہ مجھے رفیق اعلیٰ میں شامل فرما۔ پھر دفعتاً آپ ہاتھ نیچے کی طرف گر پڑے اور روحِ مطہرہ جسمِ اطہر سے پرواز کر گئی۔

اگر کوئی شخص مسواک کو مستقل طور پر چھوڑ رہے اور اس کی جانب رغبت و التفات ہی نہ کرے تو یہ طرزِ عمل سنتِ نبوی کی خلاف ورزی اور رسول ﷺ کی شاہ راہ سے ہٹ جانے کے مترادف ہوگا اور ایسے شخص کی نماز بھی مقام افضلیت اور درجۂ کمالیت سے ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر مسواک کے ترک کرنے میں عمداً اور قصداً کا رجحان ہو تو پھر مسئلہ کی نوعیت اور بھی نازک ہو جائے گی۔ عبداللہ بن مبارک کا موقف ہے۔

لوان اھل قریۃ اجتمعوا علی ترک سنۃ السواک نقاتلھم کما نقاتل المرتدین کیلا یجترئ الناس علی ترک سنۃ السواک۔ (حلیہ خانیہ وغیرہ)

اگر کسی شہر کے مسلمان مسواک ترک کرنے پر متفق ہو جائیں تو ہم ان سے قتال کریں گے۔ جس طرح مرتد لوگوں سے کرتے ہیں تاکہ مسلمان اس سنّت کو ترک کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اور حضرت اسحاق کا کہنا ہے اگر کوئی شخص مسواک کو عمداً ترک کر دے تو اس کی نماز باطل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک اور حضرت اسحاق کے نقطۂ نظر سے اتفاق یا اختلاف اپنی جگہ سہی لیکن اس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بزرگانِ متقدمین کی نظروں میں مسواک کی کس قدر فضیلت تھی۔ علامہ شیرانی نے "کشف الغمہ" میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مسواک سے اعراض کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی وہ میرے راستہ پہ نہیں ہے۔

ایک اور حدیث مرسل میں مسواک کو نصف وضو سے تعبیر کیا گیا ہے۔ السواک نصف الوضوء والوضوء نصف الایمان۔ (فتاوی رضویہ) فقہ کی کتابوں میں مسواک وضو کے ساتھ مربوط ہونے اور نہ ہونے اور اس کے مسنون اور مستحب ہونے کے بارے میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض کے نزدیک سے قبل اور بعض کے نزدیک کلی کرتے وقت سنّت ہے۔ اور بعض کے نزدیک مطلق مستحب ہے اور بعض کے نزدیک کلی سے پہلے سنّت ہے بعض کے نزدیک نماز کے لیے سنّت ہے اور بعض کے نزدیک مطلق مستحب ہے اور بعض کے نزدیک سنّتِ موکدہ ہے۔ فقہ کی معروف درسی کتاب "قدوری" میں مسواک کے مسنون ہونے کو صحیح کہا گیا ہے۔ اور "ھدایہ" میں مستحب ہونے کو صحیح ترین کہا گیا ہے۔ اور علمائے احناف کی اکثریت مسواک کے مستحب ہونے کی قائل ہے۔

غرض مسواک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کثیر العمل اور دائمی فعل ہے۔ چناں چہ ھدایہ میں مرقوم ہے:
السواك لانه صلى الله عليه وسلم كان يواظب اور یہ عمل وضو کے علاوہ دیگر مواقع پر بھی کیا جا سکتا ہے یہی وجہ کہ بعض ائمہ نے مسواک کو وضو کے خصائص میں شمار نہیں کیا۔ جیسا کہ امام زیلعی کا قول ہے۔ الصحيح انهما مستحبان يعني السواك والتسمية لانهما ليسا من خصائص الوضوء۔
(فتاوی رضویہ) وضو میں مسواک کرنا اور بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور مسواک وضو کے خصائص میں سے نہیں ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وضو کے طریقہ کو بعض جلیل القدر اور بارگاہ نبوی کے حاضر باش صحابہ کرام نے بیان کیا ہے۔ جن میں مسواک کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص وضو کرتے وقت مسواک کرنا بھول گیا اور نماز پڑھنے سے پہلے یاد آ گیا تو مسواک کر لینا مستحب ہے۔ اور اس کے علاوہ سونے سے قبل، نیز سے بیدار ہونے کے بعد، منہ میں بدبو اور تعفن محسوس ہونے پر اور لوگوں میں بیٹھنے کے وقت پر اور حسب خواہش و ضرورت پر بھی مسواک کرنا مستحب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: السواك سنة فاستاكوا اى وقت شئتم مسواک سنّت ہے جس وقت دل چاہے مسواک کرو۔

ماحصل کلام! فقہائے کرام کے جن اقوال میں وضو کے ساتھ عدم مربوط اور وقت کی عدم تخصیص کے ساتھ مسواک کے مستحب ہونے کا قول ہے، وہی قابلِ صحیح اور ترجیح ہے۔

فقہاء نے مسواک کے آداب اور مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس کی مختصر تلخیص یہاں پیش ہے۔ مسواک کرتے وقت یہ دعا پڑھ لینی چاہیے: اللّٰھم طھر فمی ونور قلبی وطھر بدنی وحرم جسدی علی النار (درایہ): اے اللہ تعالیٰ میرے منہ اور جسم کو پاک، وصاف فرما اور میرے قلب کو نور سے بھر دے اور میرے جسم کو دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھ۔

مسواک پکڑنے کا طریقہ صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس طرح منقول ہے۔

کن انگلی مسواک کے نیچے کی جانب اور انگوٹھا اوپر کی جانب مسواک کے منہ کے نیچے اور باقی انگلیاں مسواک کے اوپر رہیں۔ (شامی) مسواک ایک بالشت اور کسی قدر نرم ہونی چاہیے اور دانتوں کی لمبائی میں نہیں بلکہ چوڑائی میں کرنا چاہیے اور سیدھے ہاتھ سے مسواک کرنا چاہیے۔ پہلے سیدھے جانب کے اوپر کے دانتوں پر، پھر بائیں جانب کے اوپر کے دانتوں پر، پھر سیدھے جانب کے نیچے کے دانتوں پر، پھر بائیں جانب کے نیچے کے دانتوں پر مسواک پھیریں اور کم از کم تین تین مرتبہ سیدھے اور بائیں جانب اوپر اور نیچے کی جانب کے دانتوں میں مسواک کریں۔ اور ہر مرتبہ مسواک کو دھولینا چاہیے اور مسواک کرنے سے پہلے اور فارغ ہونے کے بعد بھی مسواک کو اچھی طرح دھولینا چاہیے۔ ورنہ اس کو شیطان استعمال کرتا ہے۔

مسواک کرنے میں تعداد کی کوئی حد نہیں ہے۔ دانتوں میں پھنسے ہوئے کھانے کے ذرّات کے ازالہ اور تعفن کو دور کرنے کے لیے جتنی مرتبہ چاہیں مسواک کریں۔ لیکن اس معاملہ میں بھی حدِ اعتدال ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ طبّی نقطۂ نظر سے بہت دیر تک مسواک کے ذریعہ دانتوں کو رگڑتے رہنے سے ان کا اینمل ختم ہوجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دانتوں کی چمک اور قوت متاثر ہوتی ہے اور ان کے کمزور ہونے اور ہل جانے کا امکان ہے۔

اور مسواک کو کھڑی رکھنی چاہیے اور سب سے بہترین مسواک پیلو یا زیتون ہے۔ پیلو کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ دانتوں کو جلا اور صفائی بخشتی ہے اور زیتون کی خاصیت یہ ہے کہ وہ دانتوں کی بدبو اور زردی کو زائل کردیتی ہے اور منہ کو خوشبودار کرتی ہے۔ اس کے تعلق سے ایک حدیث بھی موجود ہے کہ زیتون میری مسواک ہے اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام کی بھی یہی مسواک تھی۔

پیلو اور زیتون کے علاوہ دیگر لکڑیوں کو بھی مسواک کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ کہیں لکڑیوں میں زہریلے اور سمّی اثرات تو نہیں ہیں۔ فقہائے کرام نے نقصان دہ لکڑی کی مسواک کو مکروہ اور زہر رساں لکڑی کی مسواک کو حرام قرار دیا ہے: یکرہ بموذ ویحرم بذی سم۔ (درمختار)

اور جب بھی مسواک استعمال کریں بہتر یہی ہے کہ مسواک کے ریشوں کو کاٹتے رہیں اور نئے ریشے استعمال کرتے رہیں اور جب تک ہوسکے ہمیشہ تازہ مسواک استعمال کریں۔

مسواک سے متعلق ایک اور بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ وضو کے لیے استعمال ہونے والے پانی مثلاً حوض یا برتن وغیرہ میں مسواک نہیں ڈبونا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے پانی کی طہارت متاثر ہوتی ہے اور لوگوں کو بھی کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے بعض مالکی فقہاء نے مسواک کرنے سے زائل ہونے والی گندگی اور نجاست اور مسجد کے احترام کے پیشِ نظر مسجد میں مسواک کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے: وعند بعض المالکیۃ کراھیۃ فی المسجد لاستقذارہ۔ (فتاوی رضویہ)

حضرت ابراہیم نخعی کا ایک خواب صلوٰۃ مسعودی کے حوالہ سے "رسالہ فضائلِ مسواک" میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں مسواک کے علاوہ بھی دیگر امور پر مفید روشنی ہے۔ اس کی افادیت کے پیشِ نظر یہاں وہ خواب نقل کیا جارہا ہے:

منقول ہے کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ جو کچھ پڑھتے اور یاد کرتے تھے، سب بھول جاتے تھے۔ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ اپنے حال کی فریاد کی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! جو کچھ پڑھتا ہوں یاد نہیں رہتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابراہیم! چند چیزوں پر عمل کرو: کم کھاؤ، کم سوؤ، قرآن شریف زیادہ پڑھو نماز زیادہ پڑھا کرو اور ہر نماز کے لیے وضو کیا کرو اور ہر وضو میں مسواک کیا کرو۔ ابراہیم نخعی نے بیان کیا کہ جب میں نیند سے بیدار ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت پر عمل کیا تو میں تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کا پیشوا بن گیا۔

انسان کی زندگی میں صحت و تندرستی کی جو اہمیت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ صحت ہی زندگی ہے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اشیاء سے اجتناب اور احتراز کی تلقین کی جو انسان زندگی کی صحت و تندرستی کے لیے ضرر رساں ہو سکتی ہیں۔ اور ان اشیاء کے استعمال کی ترغیب و تحریص اور توجہ دلائی جو انسان کی صحت و تندرستی کا باعث ہیں۔ ماضی میں مسواک کے بارے میں جو بھی فوائد و اثرات ہمارے سامنے آچکے ہیں اور موجودہ زمانہ میں سائنسی اور طبی زاویہ سے جو بھی فوائد سامنے آرہے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ انسان کی صحت و تندرستی برقرار رکھنے میں مسواک کا کلیدی کردار ہے۔ صحت و تندرستی کی برقراری کے لیے دانتوں اور مسوڑھوں کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ ان کی صحت سے بدن کے دیگر اجزاء اور حصوں کی صحت اور ان کی عدم صحت کی وجہ سے دیگر اعضاء کا متاثر ہونا پوری طرح عیاں ہو چکا ہے۔ چناں چہ جدید میڈیکل نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض آدمی کو معدہ، جگر، منہ و حلق، کان و آنکھ وغیرہ کے امراض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اس مقام پر مسواک کے طبی فوائد سے متعلق مختلف بزرگوں کے اقوال کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرنے کے بعد اس پہلو کو بھی نمایاں کیا جائے گا کہ امراض دنداں کیسے دیگر امراض کا سبب بنتے ہیں۔

- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: السواك يزيد في الحفظ ويذهب البلغم: مسواک استعمال کرنے سے قوتِ حافظہ میں اضافہ ہوتا ہے اور بلغم زائل ہوتا ہے۔
- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: السواك شفاء من كل داء إلا السام: مسواک موت کے سوا ہر بیماری کے لیے شفاء ہے۔
- حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے: يشد اللثة ويسكن الصداع ويذهب وجع الضرس: مسواک کرنے سے مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں اور سر کا درد ختم ہوتا ہے اور داڑھ کا درد ختم ہوتا ہے۔
- حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: يجلو البصر ويشد اللثة ويطيب الفم وينفي البلغم۔ مسواک قوت بینائی میں اضافہ کرتی ہے۔ مسوڑھوں کو مضبوط بناتی ہے اور منہ کی بدبو اور بلغم کو دور کرتی ہے۔
- حضرت ابن عباس اور حضرت عطا رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے: ويقوي الأسنان ويصحح المعدہ

ویقوی البدن ویطھر القلب ..... ویبیض الانسان ویصف الحلق ویجلو اللسان ویذکی الفطنۃ ویقطع الرطوبۃ : مسواک دانتوں کو مضبوط کرتی اور چمکدار بناتی ہے ۔ معدہ کے نظام کو درست رکھتی ہے اور بدن کو قوت دیتی ہے اور قلب کو طہارت وطمانیت بخشتی ہے ۔ حلق اور زبان کو صاف رکھتی ہے ۔ ذہانت اور فطانت کو بڑھاتی ہے اور رطوبت کو دور کرتی ہے ۔

- علامہ حصکفی کا قول ہے : مسواک موت کی سختیوں میں کلمۂ شہادت یاد دلاتی ہے اور وہ موت کے سوا ہر مرض کے لیے شفاء ہے ۔

موجودہ زمانہ میں مسواک اور دیگر احکام سنّت سے متعلق جو نئی نئی تحقیقات اور سائنسی انکشافات سامنے آرہے ہیں ۔ ان سے بے شمار طبّی اور میڈیکلی فائدے سامنے آرہے ہیں ۔ عالم اسلام کے معروف محقق اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ فار ہربل کیلی فورنیا ، امریکہ کے معزز رکن اور تحقیق کی دنیا میں گولڈ میڈل یافتہ طبیب حاذق حکیم محمد طارق محمود چغتائی نے احادیث نبوی کا سائنٹفک اور سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے ۔ اس مقام پر حکیم موصوف کی شاہ کار علمی وسائنسی کتاب ”سنّتِ نبوی اور جدید سائنس“ سے مسواک کے بارے میں بعض تحقیقات وتجربات اور مشاہدات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے ۔ جو بڑی اہمیت اور افادیت کے قابل ہے :

”آدمی کو سونے سے پہلے مسواک کرلینی چاہیے ۔ کیوں کہ انسان جو چیزیں کھاتا ہے تو منہ کے اندر پیلازما صرف کلّی کرنے سے پاک صاف نہیں ہوتا ۔ عموماً دانت جو خراب ہوتے ہیں وہ سونے کے وقت ہوتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان جب سوجاتا ہے تو اس کا منہ بالکل بند ہوجاتا ہے اور بند منہ کے اندر اس کا WORK یعنی کام بہت آسان ہوجاتا ہے اور وہ Plazama اپنا پورا کام کرتا ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ دن کے وقت میں آدمی کبھی بول رہا ہے ، کبھی چل رہا ہے ، کبھی کھا رہا ہے اور کبھی پی رہا ہے ۔ دن کے وقت میں منہ حرکت کرنے کی وجہ سے پیلازما Plasma کو کام کرنے کا موقعہ نہیں مل پاتا ۔ لیکن رات کے وقت جب منہ بند ہوجاتا ہے تو اُسے کام کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے ۔ اس لیے زیادہ تر رات کے وقت دانت خراب ہوتے ہیں ۔ آدمی صبح ٹوتھ پیسٹ کرے یا نہ کرے کوئی نقصان نہیں ۔ لیکن رات کو سوتے وقت ضرور مسواک کرنا چاہیے ۔“

”نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رات کو وضو مسواک کے ساتھ کرکے سوتے تھے اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے تھے اور کھانے کے بعد کلّی کرتے تھے ۔“

لیکن آج کل لوگ کھانا کھاکر کلّی کے ذریعہ منہ صاف نہیں کرتے ، حالاں کہ ان کے منہ کے اندر غذا کے اثرات کافی دیر تک رہتے ہیں ۔

ہر مرتبہ کھانے کے بعد کلّی کرنے سے اور دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنے سے منہ کی صفائی اور آدمی کا یہ ایلکٹرونک سسٹم

Electronic System صاف ہوتے رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی کئی امراض سے محفوظ رہتا ہے۔

گرونانک مسواک کے عادی تھے۔ ان کا کہنا تھا مسواک لے لو یا پھر بیماری لے لو۔ مطلب یہ ہے کہ مسواک استعمال کرتے رہوگے تو بیماریوں سے محفوظ رہوگے ورنہ امراض سے واسطہ پڑے گا۔

حکیم ایس۔ ایم۔ اقبال فرماتے ہیں: کہ میرے پاس ایک مریض آیا۔ جس کے دل کی جھلیوں میں پیپ بھری ہوئی تھی۔ آپریشن کرکے پیپ نکالی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر پیپ بھر گئی۔ وہ میرے پاس آیا تو میں نے ان کی مکمل تشخیص کی۔ پتہ چلا کہ اس کے مسوڑھے خراب ہیں۔ اور ان کے اندر پیپ پڑی ہوئی ہے۔ اور یہی پیپ دل کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ میں اپنی یہ تشخیص دوسرے ڈاکٹروں کے سامنے پیش کی۔ انھوں نے بھی تسلیم کیا۔ اس کے بعد مریض کا پہلا علاج دانتوں اور مسوڑھوں کا کیا گیا۔ اور کچھ دوسری دوائیں بھی کھانے کے لیے دی گئیں اور پیلو کی مسواک استعمال کرنے کی تاکید کی گئی۔ الحمد للہ وہ مریض صحت یاب ہو گیا۔

بعض اطباء کے مشاہدات ہیں کانوں میں ورم، پیپ، سرخی اور درد کا ایک سبب مسوڑھوں کی خرابی اور ان کے اندر پیپ بھی ہو سکتا ہے۔

دانتوں کی پیپ یا دانتوں کی خلاؤں میں موجود خوراک کے ذرّات کی وجہ سے ضعفِ بصارت کی شکایت پیدا ہوتی ہے اور اسّی فی صد معدہ کے امراض، دانتوں کے نقائص و امراض کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مسوڑھوں کی پیپ اور جراثیم غذا کے ساتھ یا لعابِ دہن کے ساتھ معدے کے اندر چلے جاتے ہیں اور یہی چیز دیگر امراض کے پیدا ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے کہ معدہ اور جگر کے امراض کا علاج سے پہلے دانتوں کا علاج کیا جائے۔

ایک صاحب گلے کے غدود Thonsilis بڑھنے سے پریشان تھے۔ شربتِ توت پینے کے لیے دیا گیا اور بالکل تازہ مسواک استعمال کرنے کے لیے کہا گیا اور تازہ مسواک کے ٹکڑے کرکے اس کو پانی میں ابال کر اس کے غرارے کرنے کے لیے کہا گیا تو اس طریقہ سے مریض صحت یاب ہو گیا۔

مسواک دافع تعفن ہے (Anti Septic) جب بھی اس کو منہ میں استعمال کیا جائے گا تو یہ اندر کے جراثیم کو مار دیتی ہے اور بعض جراثیم مسواک کے اندر انٹی سیپٹک Anti Septic مواد ہی کے وجہ سے مر جاتے ہیں۔

مسواک کے اندر فاسفورس Phosphorous کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ تحقیقات کے مطابق جس زمین میں کیلشیم Calcium اور فاسفورس Phosphorous زیادہ ہوتی ہے وہاں پیلو کے درخت کثرت سے اگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبرستان کی مٹی میں کیلشیم اور فاسفورس انسانی ہڈیوں کے گلنے کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے اور دانتوں کے لیے کیلشیم اور فاسفورس ایک اہم غذا ہے اور خاص طور پر پیلو کی جڑ میں یہ اجزاء عام ہوتے ہیں۔ مشاہدہ میں یہ بات سامنے

آئی ہے کہ اگر پیلو کی مسواک کو تازہ اور نرم حالت میں چبایا جائے تو اس کے اندر سے ایک تلخ اور تازہ مادہ نکلتا ہے۔ یہی مادہ مسواک کے اندر جراثیموں کی نشوونما کو روکتا ہے اور دانتوں کو امراض سے بچاتا ہے۔ اس لیے یہ بات اہم ہے کہ پیلو کے مسواک کے ریشے توڑتے یا کاٹتے رہیں۔ تاکہ نئے ریشے استعمال ہوں، اور ان کا تلخ مادہ صحت کے لیے قابل استعمال رہے۔

جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دماغ کی خوراک اور معاون جہاں اور بہت سی چیزیں ہیں وہاں فاسفورس بھی ہے اور یہ فاسفورس لعاب اور مساموں کے ذریعہ دماغ تک پہنچتا ہے۔

احقر عرصہ دراز سے پائیوریا pyorhea کے مریضوں کو کنیر کی مسواک استعمال کرنے کی ہدایت دے رہا ہے اور الحمد للہ اس عمل سے لاعلاج مریض صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کنیر کی مسواک اگرچہ کڑوی ہوتی ہے لیکن دانتوں کے امراض کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے اندر ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو دانتوں کو مضبوط بناتے ہیں اور پائیوریا جیسے مہلک امراض کی روک تھام کے لیے اکسیر اعظم ہے۔

دائمی نزلہ کے مریض جن کا بلغم رکا ہوا ہوتا ہے۔ جب وہ مسواک استعمال کرتے ہیں تو بلغم اندر سے خارج ہوتا ہے۔ ایک پیتھالوجسٹ (Pathologist) فرماتے ہیں: مسواک دائمی نزلہ کے لیے تریاق ہے حتیٰ کہ مسواک مسلسل استعمال کرنے سے ناک کے آپریشن اور گلے کے آپریشن کے چانس 80 فیصد بہت کم ہو جاتے ہیں۔

1982ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن W-H-O (جنیوا، سوئٹزرلینڈ) میں ایک جامع رپورٹ میں یہ نکتہ ابھر کر آیا کہ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں غیر ترقی یافتہ ممالک میں زیادہ تر لوگ دانتوں کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق صحت دہن و دندان کی صورت حال تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں میں بشمول پاکستان، بالخصوص شہری علاقوں میں ابتر ہو رہی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں بہت سے امراض جنم لے رہے ہیں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ابتدائے آفرینش سے اب تک دنیا بھر کے لوگوں میں منہ کی صحت و صفائی کے لیے مختلف چیزیں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے حاصل ہونے والی کئی چیزیں دانتوں کے لیے استعمال سے متعلق ہیں۔ ان میں نباتاتی تعلق رکھنے والی چیزیں عموماً پودوں کی خوش ذائقہ شاخوں پر مشتمل ہیں۔ زمانہ قدیم میں استعمال ہونے والی یہ شاخ یا یہ نباتات جدید برش کی پیش رو سمجھی جا سکتی ہیں۔ کوئی سترہ پودے ایسے ہیں جو منہ، دانتوں اور مسوڑھوں کی صحت و صفائی میں مفید ہیں۔ ان میں سے جو درخت سب سے زیادہ استعمال ہو رہا ہے وہ درخت مسواک ہے۔

دانتوں کی بوسیدگی اور کرم خوردگی ایسے امراض دنداں ہیں، جن سے غفلت کے نتیجہ میں دانتوں اور مسوڑھوں کی خرابی کی مزمن صورت اختیار کر جاتی ہے اور منہ کی بدبو، شدید درد اور تکلیف کے بعد قدرتی دانت گرنے لگتے ہیں اور مصنوعی دانت لگوانے پڑتے ہیں۔ عموماً مسوڑھوں اور دانتوں کی جھریوں میں مضر جراثیم جمع ہو جانے اور غذائی مواد

وغیرہ کے سڑنے سے غذا کے ذرات، میل کچیل، جراثیم وغیرہ کی موجودگی اور اس کے تعفن پذیر ہو جانے سے ایک مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو منہ اور دانتوں کے لیے اور صحتِ جسمانی کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے۔ اگر دانت باقاعدگی سے صبح سب سے پہلے اور کم از کم پانچوں نمازوں کے وقت اور بالخصوص سوتے وقت صاف کر لیے جائیں تو صحت قائم رہتی ہے۔ مسوڑھے اور دانت صحت مند رہتے ہیں۔

دانتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور بوسیدگی، دانتوں کے معدنی جز کی بتدریج تحلیل کے نتیجے میں واقع ہوتی ہے۔ ایسا عموماً منہ کے اندر اور دانتوں کے گرد تیزابیت کے عمل سے ہوتا ہے۔ یہ تیزابیت نشاستے اور میٹھی غذاؤں کے اثرات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ نشاستے دار غذائیں اور مٹھائیاں کثرت سے کھاتے ہیں ان کے مسوڑھوں اور منہ میں یہ تیزابی مادّے تیزی سے جمع رہتے ہیں۔ شکر کی تیزابیت سے دانتوں میں شکست و ریخت ہوتی ہے اور کیڑا لگ سکتا ہے۔ مسوڑھوں میں خرابی بیکٹیریا کے عمل سے ہوتی ہے۔ جو ان میں ورم اور عفونت کا سبب بن جاتے ہیں۔

جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ درخت مسواک (پیلو کے درخت) میں جراثیم کش (Anti Bacterial) خواص موجود ہیں۔ دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کا استعمال اس طرح کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں مددگار ہے۔

مسواک مسوڑھوں میں موجود جراثیم آلائشوں کو بھی نکالتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان نقصان دہ جراثیم کو اپنے جراثیم کش اثرات کے ذریعہ ختم کرتی ہے۔ جو مسوڑھوں اور دانتوں کی بوسیدگی کا باعث بن سکتے ہیں۔

درخت مسواک کے منفرد کیمیائی اجزاء مجموعی طور پہ درختِ مسواک کے بعض حصوں میں موجود ہوتے ہیں۔ اور یکجا ہو کر ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہم درخت مسواک (پیلو) سے حاصل ہونے والے اجزا کا علاحدہ علاحدہ بھی جائزہ لیں تو ہر ایک بھی دانتوں کی تکالیف کے خلاف مؤثر نظر آتا ہے۔ یہ اس کی چھال کے خلاصے سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اجزاء درج ذیل ہیں:

۱۔ ٹرائی میتھائل ایمین (TRIMETHYLMINE)

2۔ ایک الکلائڈ جو سلواڈورین (SALVADORINE)

3۔ کلورائیڈز (CHLORIDES)

4۔ فلورائیڈز (FLUORIDE) اور سلیکا (SILICA) کی خاصی مقدار۔

5۔ گندک (SULPHERO)

6۔ حیاتین۔ سی۔ (VITAMIN—C)

7۔ ٹیننس (TANINS) سیپونین (SAPONINS)

فلیوونائڈ (FLAVONOIDS) اور اسٹیرول (STERILE) کی معمولی مقداریں اور لال کی کچھ مقدار

خواص کے اجزاء:

۱۔ ٹرائی میتھائل ایمینیز رتام (TRIMETHYLAMINER TMA) نامیاتی کیمیائی جزء (فارمولا N-3 (3 H C) جو کہ بے رنگ سیال گیس ہے اور مچھلی جیسی بو رکھتی ہے۔ اس کا نقطۂ جوش چار درجہ سنٹی گریڈ ہے۔ پانی ایتھر اور الکحل میں علاحدہ کرکے تیرنے کے قابل بنا تا ہے۔ (اس عمل کو FOURTH FLOATATION کہتے ہیں) اس طرح یہ اہم جزء غذا کے باقی رہ جانے والے اجزاء کو منہ میں اور خصوصاً دانتوں میں جمع ہونے سے روکتا ہے۔ مسواک کے دیگر اجزا مثلاً نمکیات کے ساتھ مل کر یہ جزاور زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔ اور ضد جراثیم عامل کا کام کرتا ہے۔

2۔ سلوا ڈورین (SALVADORINE)

قدرتی طور پہ پایا جانے والا یہ الکلائڈ درخت مسواک کی خشک کردہ چھال میں پایا جاتا ہے۔ اس جزپہ مزید تحقیقات ہو رہی ہیں۔

3۔ کلورائیڈ (CHLORIDES)

اپنی آئیونی (IONIC) خصوصیات کی وجہ سے منہ کی اندرونی جھلّی کے خلیات اور دیگر ساختوں میں سیال کی مقدار کا توازن برقرار رکھنے کے نظام پہ مؤثر ہوتے ہیں۔ یہ دراصل قدرتاً پائے جانے والے نمکیات ہیں، ان کی موجودگی فعلیاتی نظام کو درست رکھتی ہے۔

4۔ فلورائڈ اور سلیکا: (FLOURIDE and SILICA)

درخت پیلو (مسواک) میں قدرتی طور پہ فلورائڈ اور سلیکا، کی قابل ذکر مقدار موجود ہوتی ہے۔ عام طور پر ٹوتھ پیسٹ میں مصنوعی طور پہ فلورائڈ شامل کیا جاتا ہے اس لحاظ سے مسواک یا پیلو کو انفرادیت حاصل ہے۔ تحقیقات سے ثابت ہے کہ فلورائڈ خصوصیت کے ساتھ بچّوں میں دانتوں کی بوسیدگی کے خلاف موثر ہے اور ساتھ میں سلیکا کی موجودگی مسواک میں اس کے میکانکی عمل سے دانتوں کو چمکانے میں مددگار ہے۔

5۔ گندک: (SULPHOR)

پیلو میں موجود گندک اپنے جراثیم کش اور تریاقی اثرات کی بدولت اور منہ کی صحت کی برقراری کے لیے انتہائی اہم ہے۔

6۔ حیاتین۔سی: (VITAMIN-C)

دانتوں کی صحت اور مسوڑھوں کی حفاظت میں حیاتین سی کی اہمیت مسلم ہے۔ مسواک یا پیلو میں یہ نباتی جوہر قدرتاً پایا جاتا ہے۔ اس کی موجودگی اُسے نہ صرف ایک مؤثر میکانکی اور طبّی حیاتیاتی عامل بننے میں مدد دیتی ہے بلکہ بوسیدگیٔ دندان، متورم مسوڑھوں اور اسکربوط (SCUREY) میں بھی فائدہ مند ثابت کرتے ہیں۔ برصغیر کے اطباء زمانۂ دراز

سے مسواک کو اسکر بوط کے لیے تجویز کیا کرتے ہیں۔

7۔ رال (RESIN)

مسواک کی چھال میں موجود رالی مادّہ (RESINOUS MATERIAL) دانتوں کو سخت بیرونی طبقے یعنی نینا (ENAMEL) کی حفاظت کرتا ہے۔

پاکستان میں 1985ء میں دانت صاف کرنے کے لیے استعمال کی جانے والی مختلف پودوں کی شاخوں پر جدید طبّی تحقیقات کی گئیں۔ ان تحقیقات سے مسواک / پیلو کے ضمن میں نہایت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ اس مقصد کے لیے استعمال کی جانے والی شاخوں کا خرد حیاتی طور پر جراثیم کے خلاف تقابلی جائزہ لیا گیا۔ ان نباتات کے نام حسب ذیل ہیں:

1۔ نیم: MELIA AZADIRACHTA LINN

2۔ کیکر: ACACIA ARABICA WILD

3۔ پھلاہی: ACACIA MODESTA WALL

4۔ مسواک / پیلو: SALVADORA PERSICA LINN

5۔ کرنج: PONGAMIA GLABRA VENT

مندرجۂ بالا نباتات کا مطالعہ لیبارٹری میں مانع جراثیم سرگرمی (ANTI BACTERIAL ACTIVITY) کے لیے کیا گیا۔ یہ تقابلی جائزہ مسواک، پیلو کی خصوصی افادیت کا آئینہ دار ثابت ہوا۔

مختلف افراد کے دانتوں، مسوڑھوں اور منہ سے لعابِ دہن حاصل کیا گیا۔ اور ان میں سے چند ایسے جرثومے علاحدہ کر کے ان کی لیبارٹری میں مصنوعی طور پر افزائش کی گئی جو دہن و دندان کی مختلف تکالیف میں اہم ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان جراثیم کے خلاف درج بالا نباتات کی صلاحیتوں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ درج بالا نباتات میں کوئی بھی بیکٹیریا (SARCINA LUTEA) اور (BACILLUS PUMILIS) کے خلاف قابلِ ذکر اثرات کا حامل نہیں پایا۔ لیکن پیلو یا مسواک کو مجموعی طور پر لعابِ دہن سے حاصل کئے گئے بیکٹیریا کے خلاف موثر پایا گیا اور اس کے مانع جراثیم (ANTI MICRO-BIAL) جراثیم کش (GERMICIDAL) اور مانع فنج (FUNGICIDAL) اثرات کا معیار تقابلی تمام نباتات سے بہتر پایا گیا۔

تجربات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ مسواک یا پیلو میں ان خصوصیات کے علاوہ مسوڑھوں کو سکیڑنے، صاف کرنے اور مانجھنے (ABRASIVE) کی خصوصیات بھی ہیں۔ نہ صرف مسواک بلکہ اس کا سفوف بھی دہن، دانت اور مسوڑھوں کی صفائی کے لیے بہترین چیز ہے۔

حاصلِ کلام!

سیاق میں مسواک سے متعلق ایک صاحب حکمت مصنف محقق کے مطالعہ وتحقیق کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے اصحاب تحقیق وارباب سائنس ہیں جنھوں نے بڑی گہرائی وگیرائی اور ہمہ جہتی رخ سے مسواک پر ریسرچ کیا ہے اوران کے مختلف النوع تحقیقات سامنے آچکی ہیں۔ ان سب کا مختصر ترین احاطہ بھی طوالت کا باعث ہوگا۔ آج امریکہ اور ترقی یافتہ ممالک میں نہ صرف مسواک بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا انتہائی تعمق کے ساتھ سائنسی تجزیہ اور مطالعہ کیا جارہا ہے اور علمی وتحقیقی اور مشاہداتی وتجرباتی بنیادوں پر یہ رجحان پیدا ہورہا ہے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سنتیں، انسانی فطرت وطبیعت سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اوران سنتوں کے اندر انسان کے لیے نہ صرف روحانی بلکہ عقلی، ذہنی، قلبی، جسمانی اور مادی فوائد اور برکات ہیں۔ موجودہ زمانہ کو سائنس کا غلبہ وتسلّط اوراس کی عمومیت و وسعت کی وجہ سے سائنسی دَور کہا جارہا ہے۔ اوراہل زمانہ کی سوچ اور فکر پر سائنسی چھاپ اس قدر گہری ہوتی جارہی ہے کہ وہ ہر چیز کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور جانچنے اور قبول کرنے کے عادی بنتے جارہے ہیں۔ اور یہ طرز فکر مسلمانوں میں بھی عام ہوتے جارہے ہیں۔ اور ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام کی ہر چیز کو سائنسی تائید اور سائنسی فوائد کی روشنی میں دیکھنے لگا ہے۔ اوراسی چیز کو لائق اعتنا سمجھنے لگا ہے جس کے فوائد کی نشان دہی کتاب وسنّت سے کہیں زیادہ سائنس کی زبان نے کی ہو۔ اسی لیے اس مقالہ میں مسواک سے متعلق چند ایسی چیزوں کو بھی جگہ دی گئی جن کی تائید وحمایت سائنس وطب اور جدید میڈیکل نے کی ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ اوراس کے رسول کے احکام کو بے چون وچرا تسلیم کرلینے کا نام ہی ایمان ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جس بات کا حکم دیا ہے اسے بغیر کسی علمی ومنطقی اور سائنسی تجزیہ وتائید کے قبول کرنا ہے اور جس بات سے منع فرمایا ہے۔ اسے چھوڑ دینا ہے خواہ زمانہ کا کوئی بھی علم وفن اس کے فوائد ومحاسن کے دفتر کھول دے۔ بے شک اسلامی احکامات کا ایک پہلو دینی وروحانی اور اخروی ہے تو دوسرا پہلو مادی وعقلی اور علمی وسیاسی اور دنیاوی بھی ہے اوراس دوسرے پہلو کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت وضرورت اور افادیت ہے۔ جس کی جانب بھی التفات اور استفادہ ضروری ہے۔ لیکن اس دوسرے پہلو ہی پر تمام تر توجہ مبذول کرنا اور یہ سمجھ بیٹھنا کہ اسلام یہی ہے اوراس کے احکامات کی غرض بھی یہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر اسلام کے بنیادی مقصد جو خالص طاعت الٰہی کامل سپردگی اور طہارت باطنی ہے۔ اس سے ہمیں دور کردے گا۔ مثلاً سیاست ہی کو لیجیے اسلام میں اس کی اہمیت اپنی جگہ ضرور ہے۔ لیکن سیاست سے متعلق یہ نظریہ قائم کرلینا کہ سیاست ہی اسلام ہے اور اسلام ہی سیاست ہے تو ظاہر ہے کہ یہ افراط ہے اوراس کے برعکس دوسرے پہلو کو لائق اعتنا نہ سمجھنا اور اس کے افادی پہلو کو نظر انداز کردینا یہ تفریط ہے اور اسلام میں افراط وتفریط دونوں پہلو غیر مستحسن ہیں۔

وما علینا الا البلاغ ٭٭



فتویٰ

ادارہ

موجودہ زمانے میں جو مسائل اختلاف کی نذر ہیں ان میں سے ایک مسئلہ مصافحہ کا ہے جو ہمارے ملک کے اکثر علاقوں میں نمازِ فجر وجمعہ اور عیدین کے موقعہ پر کیا جاتا ہے۔ اس عمل اور طریقہ کے تعلق سے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہؓ کے زمانہ میں یہ طریقہ نہیں تھا۔ لہذا یہ شریعت کے خلاف ہے۔ یہ موقف اختیار کرنے کی صورت میں عہدِ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ کے بعد رونما ہونے والے سارے اعمال وافعال کو کلی اور مجموعی طور پر خلافِ شرع قرار دینا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ موقف اور طرزِ عمل اور طریقۂ فکر ناقابلِ درست اور ناقابلِ اخذ قرار پائے گا۔ لہذا ایسی صورت میں شرعی اصول اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں ہر نئے فعل وعمل کا جائزہ اس کے حسن وقبح، نفع وضرر اور حکمت ومصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے لینا ہوگا۔ مصافحہ کی یہ مروجہ عادت اور طریقہ زمانۂ خیر القرون کے بعد کی ایجاد سہی لیکن یہ عمل اپنے اصل کے لحاظ سے مستحسن اور تخصیص کے لحاظ سے بدعتِ حسنہ ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی اپنی ذات اور حیثیت سے جزوی اور فروعی نوعیت کا ہے۔ لہذا اسے ایک جداگانہ اور مستقل شناخت کا درجہ نہیں دینا چاہیے۔ اور اس میں غلو وشدت اور تعصب وایذا رسانی کا پہلو شامل نہ ہونے دیں اور یہ شرعی ضابطہ سامنے رکھنا چاہیے کہ جس مستحب ومستحسن فعل میں منکراتِ شرعیہ شامل ہوجائیں تو اس مستحب کام کو ترک کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اس مقام پر مصافحہ کے طریقہ اور شکل کی وضاحت بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دست ان کے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں تھا۔ یعنی ہر ایک شخص کا ایک ہاتھ دوسرے کے دونوں ہاتھوں کے درمیان ہو۔

آج سے نصف صدی قبل اوقاتِ مخصوصہ میں مصافحہ کا سوال کھڑا ہوگیا تو اس وقت کے معروف عالمِ دین ومفتیٔ شرعِ متین حضرت مولانا محمد حبیب اللہ، چیف قاضی، صوبۂ تمل ناڈو نے اس کا مختصر وجامع جواب سپردِ قلم کیا تھا۔ جس کو من وعن یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق غفرلہ
استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ ویلور

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین اس بارے میں کہ نماز عید، نماز جمعہ اور صبح وغیرہ کے بعد بایکدیگر مصافحہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

حامداً اللہ ومصلیاً ومسلماً علی رسولہ وآلہ وصحبہ۔

عید کی نماز کے بعد اور نمازِ جمعہ، صبح وغیرہ کے بعد نماز باجماعت کی نعمت کی حاصل ہونے اور اوقات فاضلہ میں تجدید ملاقات میسر ہونے کی خوشی میں مصافحہ کو علماءِ محققین نے جائز اور مستحسن فرمایا ہے۔ کیوں کہ اصل مصافحہ سنّت ہے اور جب کبھی دو مسلمان باہم ملاقات کریں تو اُن کے لیے مصافحہ کا حکم حدیث سے ثابت ہے۔ چند علماء کو تخصیصِ وقت میں تامل ہے۔ لیکن محققین کے پاس جائز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اذکار میں لکھا ہے کہ واصل المصافحۃ سنّۃ وکونھم حافظوا علیھا فی بعض الاحوال لایخرج ذالک عن اصل السنۃ انتھی۔ (فتح الباری شرح بخاری: ص۴۷: جلد۱۱) یعنی اصل مصافحہ سنّت ہے بعض احوال میں (جیسے بعد نماز صبح وعصر وغیرہ) اس پر محافظت کرنے سے اصل سنّت سے اس کو خارج نہیں کرتا ہے۔

علامہ طحاوی نے باب العیدین میں لکھا ہے وتستحب المصافحۃ بل ھی سنۃ عقب الصلوٰۃ کلھا وعند کل لقی ابوالسعود وعن الشرنبالیہ الخ یعنی مصافحہ مستحب ہے بلکہ سنّت ہے تمام نمازوں کے بعد اور ہر ایک ملاقات کے وقت۔

مولانا شاہ احمد سعید مدنی مجددی نے تحقیق الحق المبین میں لکھا ہے: چیز یکہ خوبی او از شارع علیہ السلام ثابت شد از تخصیص وقت و روز حسن آں نمی رود انتہی: یعنے جس چیز کی خوبی شارع علیہ السلام سے ثابت ہوی ہو اس میں وقت و روز کی تخصیص کرنے سے اس کی خوبی نہیں چلی جاتی۔

علامہ عینی نے کاشف شرحِ مشکوٰۃ میں مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے شرحِ موطا میں مولوی اسماعیل نے (جن کا قول غیر مقلدین کے پاس مستند ہے) عبدالحکیم پنجابی کی تفسیر وما اہل بہ لغیر اللہ کے جواب میں معانقہ اور مصافحہ اور مصافحہ کا عید کے روز اور نیز بعد نماز صبح وعصر کے جائز ہونا بدلائل ثابت کیا ہے۔

درِمختار میں لکھا ہے کالمصافحۃ ای کما تجوز المصافحۃ لانھا سنۃ قدیمۃ متواترۃ لقولہ علیہ السلام من صافح اخاہ المسلم وحرکت یدہ تناثرت ذنوبہ واطلاق المصنف تبعا للدر والکنز والوقایۃ والنقابۃ والمجمع والملتقی وغیرھا تفید جوازھا مطلقا ولو بعد العصر؛ یعنی مصافحہ جائز ہے اس لیے کہ وہ سنّت ہے۔ قدیمہ متواترہ ہے، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اپنے

مسلمان بھائی سے مصافحہ کیا اور اپنے ہاتھ کو حرکت دی تو اس کے گناہ ساقط ہو جاتے ہیں اور مصنف کا وردکنز و وقایہ و مجمع اور ملتقی وغیرہ کی تابعداری کرتے مصافحہ کو مطلقاً ذکر کرنا فائدہ بخشتا ہے کہ مصافحہ سب حال میں جائز ہے اگرچہ بعد نماز عصر کے ہو۔

مولانا سلامت اللہ محدث نے اشباع الکلام میں نقل کیا ہے: ومباحة كالمصافحة عقيب الصبح و العصر: انتہٰی

حضرت مولانا الحاج مفتی محمود نے فتاوے میں لکھا ہے کہ احادیث صحیحہ سے مصافحہ کا وقت ملاقات سنّت ہونا ثابت ہے۔ احادیث میں اذا لقی اور اذا لتقیا اور عند التلاقی وغیرہ الفاظ سے وارد ہے عام ہے جس وقت ملاقات ہوگی اس پر شامل ہے۔ پس جتنے افراد اس کے ہیں سب متصف بر سنّت ہوں گے اور اس کے بعض افراد کے ساتھ زیادہ اہتمام کرنا اس کی فردیت سے خارج نہیں کرتا۔

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مامن مسلمين يلتقيان فيصافحان الاغفرلهما قبل ان يتفرقا یعنی نہیں دو مسلمان کہ باہدیگر ملاقات کرتے ہیں پس مصافحہ کرتے ہیں بخشش کی جاتی ہے ان کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے آگے۔ واللہ الموفق؛

مرقوم ۱۴ ماہ ذی القعدۃ الحرام ۱۳۶۵ سنہ ہجری
روز پنجشنبہ

کتبہ محمد حبیب اللہ کان اللہ لہٗ
سر قاضی مدراس

الجواب صحیح
محمد عبدالباسط قادری عفی عنہٗ
(باغ دیوان صاحب۔ مدراس)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ متین کہ اکثر جگہ مساجد میں جمعہ کا خطبہ شروع ہونے کے تھوڑا آگے موذن ندا کرتا ہے الصلوة سنته الجمعته رحمكم الله ایسا کہنا شرعاً جائز ہے یا نہیں

الجواب

حامداً اللّٰہ ومصلیاً ومسلماً علی رسولہ وآلہ وصحبہ

جمعہ کا خطبہ شروع ہونے کے تھوڑا آگے موذن الصلوۃ سنۃ الجمعۃ رحمکم اللّٰہ [یعنی سنّت نماز قبل جمعہ کی پڑھو۔ اللّٰہ تم پر رحم کرے۔] کہنا شرعاً جائز بلکہ مستحسن ہے۔ فقہائے کرام کے ضوابط پر نظر کرتے ہوئے اس کو منع کرنے کے لیے کوئی قوی دلیل نہیں پائی جاتی۔ صرف اس کا بدعت ہونا برائی کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ بدعت کے اقسام میں حسنہ بھی تو ہوتی ہے۔ فقیہ محقق علامہ مدقق فتح محمد محدّث برہان پوریؒ نے مفتاح الصلوۃ میں لکھا ہے: واذن سنت در فتاوے حجت مذکور است قال بعد الاذان الاول ثم یوذن قبل السُّنّۃ وقبل الخطبۃ وفی حاشیۃ الھدایۃ اذان السنۃ احدثھا الحجاج وکان یقول شیخی وابی اعنی عین العرفاء مسیح الاولیاء انہ بحضر من الصحابۃ من غیر نکیر فکان اجماعاً علی جوازہ فلا یکون بدعۃ منکرۃ بل حسنۃ و ہر کہ بد اہد اورا منع نباید کرد۔ انتہی: یعنے سنت نماز کا اعلان کا حکم فتاوی حجت میں مذکور ہے کہ مصنف نے کہا اذانِ اول کے بعد سنّت نماز کے آگے اعلان کیا جائے اور خطبہ کے آگے اذان بھی جائے۔ حاشیۂ ہدایہ میں ہے کہ اس اعلانِ سنّت کو حجاج نے ایجاد کیا۔

میرے والد بزرگوار عین العرفاء مسیح الاولیاء فرماتے تھے کہ حجاج نے صحابہ رضی اللّٰہ عنہم کی حضوری میں ایجاد کیا اور کسی نے انکار نہ کیا۔ پس اس کے جواز پر اجماع ہوچکا تو یہ بدعتِ سئیہ نہیں ہوی بلکہ حسنہ ہوی۔ حاصلِ کلام ایں کہ اس کو منع نہ کرنا چاہیے۔ انتہی۔

چوں کہ خطبہ کے وقت نماز اور کلام منع ہے۔ بعض لوگ غفلت سے سنّت نماز نہ پڑھ کے بیٹھے رہتے اور خطبہ کے وقت ادا کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان کی اطلاع کے لیے خطبہ کے لیے ندا کی جاتی ہے کہ اب خطبہ شروع ہونے والا ہے سنتوں سے فارغ ہوجاؤ۔ اس کو بُرا نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ واللّٰہ الموفق ؎

مرقوم ۱۵ ماہ ربیع الآخر ۱۳۶۴ھ بروز جمعہ

کتبہ محمد حبیب اللّٰہ کان اللّٰہ لہ مدراس

الجواب صحیح ؎

ھذا اصح الاجوبۃ
محمد ابوبکر عفی عنہ

مکتوبات

حضرت قطب ویلور علیہ الرحمہ

مجدّد جنوب حضرت قطب ویلور علیہ الرحمہ نے اپنے مریدین ومعتقدین اور تلامذہ وخلفاء کے نام فارسی میں خطوط تحریر فرمایا ہے۔ جن میں کئی ایک موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض مکتوبات کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے

مترجم: مولوی حافظ ابوالنعمان بشیر الحق قریشی قادری لطیفی۔ ایم، اے؛

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکتوب بنام افضل العلماء مولانا محمد ارتضاء علی خان صفوی

الحمد للہ کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ہر چند کہ یہ مسکین آپ کی صحبت بابرکت سے محروم ہے لیکن ہمیشہ آن مخدوم کی خیر وخوبی اور خیر وعافیت کا خواہاں وجویاں و دعاگو رہتا ہے۔ کیوں کہ آپ کی خیریت وعافیت اور صحت وسلامتی ہی مسلمانوں کے جم غفیر کی خیریت اور رفاہیت ہے۔ لہذا آپ کے حق میں دعا کرنا گویا تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان ساری چیزوں سے محفوظ رکھے۔ جو آپ کے لائق نہیں ہیں۔

آپ کے قاضی ہونے اور مقدمات شرعیہ کے نافذ ہونے اور لوگوں کے فیض پانے کی خبر کانوں تک پہنچی۔ یہ خبر سارے مسلمانوں کے لیے فرحت بخش اور جاں فزا ہے۔ ہم لوگ بڑے خوش نصیب ہیں کہ انگریزوں کی حکومت میں ایک قاضی اسلام کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں اور بہت ساری تہمتوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہیں؛ الحمد للہ علی ذلک

حضرت خواجہ احرار قدس سرہٗ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ شریعت مطہرہ کی ترویج اور مسلمانوں کی تائید کے خیال سے امراء وسلاطین کی صحبت اختیار کرتے تھے اور اپنے اثر ورسوخ سے انھیں مطیع اور منقاد بناتے ہوئے مسلمانوں کی نصرت و

حمایت پر آمادہ کرتے تھے اور احکام شرعیہ کے نفاذ کی کوشش کرتے تھے۔ اگر کوئی بزرگ آج کے دور میں امراء و اغنیاء کی صحبت و ہم نشینی اختیار کرے اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کو نفع پہنچائے اور عدل و انصاف قائم کرے تو اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہ ہوگی۔ ایک گھنٹہ کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

یہ مسکین آپ کی ذاتِ شریف کو مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی مدد اور اسلام کے لیے رونق خیال کرتا ہے۔ اور آپ کی صحبت بابرکت کا خواہاں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ وہ آپ کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تقویت اور اسلام کی رونق میں اضافہ فرمائے گا۔ اور اس مسکین کو آپ کی صحبتِ شریف کے شرف سے مشرف فرمائے گا۔

مکتوب بنام مرتضیٰ حسین صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام مسنون اور دعاؤں کے بعد

ظاہر ہو کہ آپ کا محبت نامہ مورخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ نظر نواز ہوا۔ کدورت آگین مضامین سے آگاہ کیا۔ دنیائے نابکار کی بے وفائی اور روزگار کی تنگی اور بھائیوں کی بدسلوکی کی خبریں پڑھ کر دل مضطرب اور بے چین ہو گیا۔

سعادت آثار!

یادِ حق کے سوا ہر خیال دل میں ظلمت اور زنگ لاتا ہے اور ذکرِ حق ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ ظلمت کو دور اور قلب کو صیقل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حق کی جانب مکمل رجوع کیجیے اور اس پہلو پر غور کیجیے: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا: رزاقِ مطلق نے کس طرح بندوں کے رزق کی ذمہ داری اور کفالت اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ بغیر طلب کے بچہ کو شکم مادر میں ناف سے رزق فراہم کرتا ہے اور پھر اس کی پیدائش کے بعد ماں کے سینے سے رزق پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد رزق کی فراہمی کے لیے کسب و قوت کا شعور اور اس کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ شیخ سعدی نے کیسی عمدہ بات کہی ہے: ؎

ادیم زمین سفرۂ عام اوست　　　بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اللہ تعالیٰ کا دسترخوان کس قدر عام ہے کہ اس سے مومن اور کافر سب مستفیض ہو رہے ہیں۔ لیکن مومن کو چاہیے کہ وہ دنیا میں اس طرح رہے جس طرح کوئی بیت الخلاء میں بڑی کراہت کے ساتھ ضرورت کے مقدار تک ہی رہتا ہے۔ اور اس میں رہنے کی کوئی رغبت اور خواہش نہیں رہتی۔ جیسے ہی ضرورت پوری ہوئی وہاں سے نکل کھڑا ہو جاتا ہے۔

سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کئی کئی روز تک اپنے شکم مبارک پر پتھر[1] باندھا کرتے اور کبھی کھجور کے چند دانوں پر اکتفا کرتے

---

[1] ایک قسم کا پتھر ہوتا تھا جسے پیٹ پر باندھنے سے بھوک زائل ہو جاتی تھی۔ (مترجم)

کرتے تھے۔ جن کو دقل کہا جاتا تھا۔ اور کبھی کیکر کے پتّوں پہ قناعت کرتے تھے۔ اور کئی کئی دنوں تک گھر میں چولھا نہیں سلگتا تھا اور چراغ روشن نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ ہونے کے باوجود اپنی خلافت کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں اینٹ تیار کرتے تھے اور اس کو فروخت کرکے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا گزارہ کرتے تھے۔

خواجہ اویس قرنیؒ جو حضرات تابعین کی جماعت میں افضل ترین بزرگ تھے۔ ان کی زندگی کا یہ حال تھا کہ لوگ انہیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ سال دو سال گزر جاتے تھے کوئی انھیں دیکھ نہیں پاتا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کہاں رہتے تھے اور کیا کھاتے پیتے تھے۔ ان کی بھی غذا صرف کھجور تھی اور ان کے لباس میں پیوند لگے رہتے تھے۔

ملّا علی قاریؒ جو جلیل القدر عالم اور مصنف تھے، جنھوں نے "مرقاۃ"، "منیح الازھر"، "حزب الاعظم" وغیرہ جیسی وقیع کتابیں لکھیں، ان کے گزر بسر کا یہ عالم تھا کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کاٹ کر مکہ مکرمہ لاتے تھے اور ان کو فروخت کرکے اپنا اور اپنی بیوی بچّوں کا پیٹ پالتے تھے۔

سعادت آثار!

جس شب میں فاقہ ہو تو وہ شب درویش کے لیے شب معراج ہوتی ہے اور جو نماز سیرابی و شکم پری کے ساتھ پڑھی جائے اس نماز میں شیطان نمازی کو اپنی باہوں میں لیے رہتا ہے۔

اللہ تعالے سے امید ہے کہ ہم لذائذ عاجلہ، تعلقات پراگندہ، غذائے چرب و شیریں سے، لباسِ منقش و رنگین، طلبِ عزت، وجاہت دنیا سے، قربِ اغنیا سے فریب نہ کھائیں گے جو کہ سراسر فانی اور ناپائیدار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی باقی رہنے والی محبت کی بو سے اپنی مشام کو معطر کریں گے اور مختصر ترین دنیا کی بہن صنوں میں نہیں پھنسیں گے جو قبر میں کام آنے والی نہیں ہے اور موت کی یاد اور آخرت کے احوال کو پیشِ نظر رکھیں گے۔

اصل کام تو بس یہی ہے اور باقی سب ہیچ ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اللہ کی نصرت وحمایت تمہارے ساتھ رہے تم جہاں کہیں رہو۔

مکتوب بنام حفیظ اللہ خان بہادر حافظ یار جنگ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد وصلوۃ اور سلام و دعا کے بعد

خاطرِ شریف پر واضح ہو کہ اس کے قبل فقیر ایک تحریر حرمین شریفین کے عزم سے متعلق ارسال خدمت کیا تھا۔ دستیاب ہوئی ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ مکان کی زمین پر مسافر خانہ، دیوان خانہ، زنانہ خانہ، درگاہ، مسجد کے علاوہ چھوٹے بڑے ۵ گھر ہیں اور اس کے مکینوں کو اس سرزمین پر بود و باش اختیار کئے ہوئے ایک سو سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اور یہ کمپنی کے علاقہ دار ہیں۔ اب ظاہر ہوا ہے کہ اربابِ حکومت اپنے علاقہ داروں کو ان کو توڑنے کے بارے میں اجازت دے چکے ہیں۔ اس کے قبل بھی ۱۸۰۷ء میں مکان کے ۲۸ گھر توڑ چکے ہیں۔

اور ان کی زمین کو ریونیو میں داخل کر چکے ہیں۔ اور زمین کا عوض بھی نہیں دیئے ہیں۔ اسی زمانہ میں نواب عظیم الدولہ کی مساعئ جمیلہ کے باعث ویلور کے قلعہ دار کو حکومت کی جانب سے یہ تاکید کی گئی تھی کہ مکان کے گھروں پر کسی قسم کی دست انداز نہ کریں۔ چنانچہ اس آرڈر کی نقل بھی ترجمہ کے ساتھ ملفوف ہے دیکھ لیں۔

یہ مسکین اپنے گھر کو امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے عمل کے موافق دعویٰ کے وقت حاضر رکھتا ہے۔ سنگ و خشت اور چوب و گچ اور دنیا و مافیہا کی چیزوں کی محبت سے جو اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ملعون اور مبغوض ہے۔ اپنے قلب کو پاک و صاف رکھا ہے۔ اور اس کے قلب میں حج بیت اللہ و زیارتِ رسول اللہ اور اس فضیلت نشان زمین میں دفن ہونے کے سوا کوئی آرزو اور تڑپ نہیں ہے۔ واللہ علی کل شیئ قدیر: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ لیکن بہ بے تکلف التماس محض ان غرباء کی جانب نظر کرتے ہوئے کر رہا ہوں۔ جو مکان کی زمین پر زمانۂ قدیم سے سکونت پذیر ہیں۔ اگر آپ صلاح اور درست خیال کرتے ہوں تو رئیس مسلمانان کے حضور یہ معروضہ پیش کریں جو مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں۔

اور اس اقدام میں فقیر کی کوئی غرض اور منفعت، ہوا و ہوس اور ریا و سمعت نہیں ہے۔ واللہ علی مانقول وکیل اللہ تعالیٰ ہمارے قول پر گواہ ہے۔ زیادہ کیا تحریر کروں۔

مکتوب بنام محمد سلیم صاحب ناگپوری

سلام مسنون کے بعد واضح ہو کہ ۲۷ رجمادی الاول ۱۲۸۳ھ کا تحریر کردہ مکتوب گرامی جمادی الاخریٰ کے اوائل میں دست یاب ہوا۔ اور کتاب "زاد المسافرین" ۲۷ رجمادی الاخریٰ کو موصول ہوی۔ یاد فرمائی کا شکریہ آپ نے اپنی کتاب مطالعہ کرنے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ یہ فقیر اس وقت عمر کے ۷۷ ویں سال میں قدم رکھ چکا ہے اور لبِ گور بیٹھا ہوا ہے۔ مزید طرفہ یہ ہے کہ ایک انار سو بیمار اور ایک سر ہزار سودا کا معاملہ ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت ہی قلیل الفرصت ہوں۔ بہر حال کسی بھی طرح آپ کے حسبِ ایما کتاب پڑھ لیا۔

اسلام کی اجنبیت و غربت کے اس دور میں رجال دین کے وجود سے آگہی ہوی اور سچ تو یہ ہے کہ اس علاقہ میں کوئی ایسا صاحبِ قلم نہیں ہے جو عوام و خواص کے لیے ایسی یکساں مفید کتاب لکھے۔

آپ نے عجیب و غریب اسلوب سے رفعت و عظمت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض و برکات کو

دوام بخشے۔

وہاں کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ وہ آپ جیسے بزرگ کے زیر سایہ زندگی گزار رہے ہیں اور صحیح طور پر امور دینیہ کو انجام دے رہے ہیں۔ آج کے دن آپ کی کتاب بھیج دی گئی ہے۔ یہ فقیر غربت اسلام کے اس دور میں آپ کے وجود کو مسلمانوں کے لیے غنیمت خیال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور آپ اور آپ کے کاموں میں خیر و برکت عطا کرے۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

مکتوب بنام عمر خان کوتوال پلٹن ہفتم

حمد و صلوۃ اور سلام و دعا کے بعد واضح ہو کہ ۲۲ اپریل ۱۲۲۱ء کا تحریر کردہ التفات نامہ موصول ہوا۔ دینی و شرعی مسائل کے استفسار پر مشتمل رہنے کی وجہ سے قلب کو فرحت حاصل ہوی۔ نیز آپ کی خیریت و کیفیت سے آگاہی ہوی۔ الحمد للہ علی ذالک۔

آپ نے سات مسائل سے متعلق شرعی احکام دریافت کیا تھا۔

سعادت آثار!

اس لاعلمی کے دور میں عوام کے اندر بڑی افراط و تفریط ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوے فقیر نے ایک کتاب 'فصل الخطاب' لکھا ہے، جو عنقریب مولوی غلام قادر مدراسی کے پریس سے شائع ہو جائے گی۔ لہذا آپ اپنے مسائل کا حل اسی کتاب میں دیکھ لیں۔

المجتہد یخطی و یصیب کے حکم کے مطابق اجتہادی مسائل اور استنباطی احکام میں خطا اور صواب دونوں پہلو ہیں۔ خواہ مجتہد مستقل ہو یا غیر مستقل۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اجتہادی احکام میں صحت و صواب کی وجہ سے مجتہد کو دو اجر ہیں اور اگر اس سے خطا ہو جائے تو ایک اجر ضرور حاصل ہوگا۔ لہذا خطا کی صورت میں بھی مجتہد کی تقلید نجات اور ثواب کا باعث ہے

ایک عامی مقلد کو بجز ضرورت اور احتیاط کے اپنے امام کے مذہب کے خلاف عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ "کیمیائے سعادت" کے رکن دوم کی نویں فصل میں لکھتے ہیں:

"ایک حنفی المذہب آدمی بغیر ولی کے نکاح کرے اور شفعۂ جوار (گھر اور زمین میں ہم سائیگی) حاصل کرے تو شافعی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ اس پر اعتراض کرے اور یہی حکم دوسرے مسائل کے اندر بھی ہے۔

اور اس کے برعکس ایک شافعی المذہب آدمی بغیر ولی کے نکاح کرے یا خرما کی نبیذ پی لے تو حنفی شخص کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو منع کرے۔ کیوں کہ اپنے امام کی مخالفت کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

اور اس مسئلہ میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ جو شخص اپنے اجتہاد کے خلاف عمل کرے یا اپنے امام کے مذہب کے خلاف عمل کرے تو وہ گنہ گار ہوگا اور یہ درحقیقت حرام ہے۔ چناں چہ ایک شخص اپنے اجتہاد سے قبلہ کا رخ مقرر کرے اور پھر اسی کی جانب پشت کرتے ہوئے نماز ادا کرے تو وہ گنہ گار ہوگا۔ اگر چہ کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ وہ قبلہ کی صحیح سمت نماز ادا کر رہا ہے۔

یہ بات جو کہی جارہی ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی سے اہلِ سنّت وجماعت کے چار مذاہب میں سے جس مذہب کے مسئلہ پر چاہے عمل کر سکتا ہے۔ یہ بالکل بے ہودہ اور ناقابلِ اعتماد بات ہے۔

ہر شخص اس بات کا مکلف ہے کہ وہ صرف اپنے ہی امام کے مذہب پر عمل کرے کیوں کہ جب وہ اپنے امام کی اقتدا کرتا ہے تو اس کا خیال یہی رہتا ہے کہ میرے امام فاضل تر ہیں تو پھر وہ بعض مسائل میں اپنے امام شافعی کو چھوڑ کر دوسرے امام کی تقلید کرتا ہے تو اس کے طرزِ عمل میں شہوت اور نفس کے سوا کوئی دوسرا سبب نہیں ہو سکتا۔

"شرح منہاج الوصول الی علم الوصول" کے مصنف رقم طراز ہیں:

امام شافعی اور دیگر ائمہ مجتہدین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک عامی مقلد پر واجب ہے کہ وہ جمیع احکام میں اپنے ہی امام کی اقتداء کرے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بادشاہِ بخارا کے چھٹے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔

اگر ایک حنفی المذہب آدمی شافعی مذہب پر عمل کرنا چاہے تو تین صورتوں میں جائز ہے:

پہلی صورت یہ ہے کہ حنفی مذہب جس مسئلہ میں شافعی مذہب پر عمل کرنا چاہے تو اس کو چاہیے اس مسئلہ میں شافعی مذہب کی ترجیح اور افادیت کتاب وسنّت کی روشنی میں پیش کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صرف ایک مجتہد ہی کر سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسی مشکل ہے جس سے چھٹکارا صرف شافعی مذہب پر عمل کرنے سے ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ان شہروں میں پانی کے مسائل یا مفقود الخبر کے احکام وغیرہ۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حنفی المذہب آدمی صاحبِ تقویٰ ہو اور وہ صرف احتیاط کے خیال سے شافعی المذہب پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے مقدارِ متعین سے زیادہ صدقہ نکالنا یا مور کا گوشت استعمال نہ کرنا وغیرہ۔

لیکن ان تین وجوہات کے اندر ایک اور شرط بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک حنفی المذہب دوسرے مذہب پر عمل کرنے کی صورت میں تلفیق نہ ہو۔ یعنی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ ہر دو مذہب میں جائز نہ رہے۔ مثلاً فصد کو ناقضِ وضو نہ سمجھے پھر اسی وضو سے نماز ایسے امام کے پیچھے پڑھے جو فاتحہ کی قراءت نہ کرے۔

یہ بات دونوں مذاہب میں جائز نہ ہوگی۔ حنفی مذہب کے مطابق وضو باطل ہوا اور شافعی مذہب کے مطابق نماز باطل ہوئی۔

لہٰذا مذکورہ تین وجوہات سے ہٹ کر کوئی حنفی المذہب امام شافعی کی اتباع کرے یا کوئی شافعی المذہب امام

ابوحنیفہ کی اتباع کرے تو مکروہ بلکہ حرام کے قریب ہے۔ اگر ہر شخص اپنی خواہش سے ائمۂ اربعہ کے مسائل و احکام میں سے جس حکم پر چاہے عمل کرنا شروع کردے تو یہ صرف اپنے نفس اور خواہش کی پیروی ہوگی اور یہ طرزِ عمل دین کے اندر ایک کھیل تماشہ کے سوا کچھ نہیں۔

مولانا عبدالعلی حنفی لکھنوی نے "شرح مسلم" میں اور مولانا محمد اسماعیل حنفی دہلوی نے "ایضاح الحق" میں یہ جو لکھ دیا ہے کہ مجتہد معین کی تقلید واجب نہیں ہے۔ اس سے ان حضرات کی مراد وجوبِ استمراری ہے۔ چنانچہ یہی وضاحت "تنویر العینین" وغیرہ میں لکھی ہے۔

اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک معین مجتہد کی اتباع نہ کریں اور اسپ بے لگام کی روش اختیار کریں اور دین کو کھیل کا میدان بنا ڈالیں : معاذ اللہ من ذلک۔

اگر یہ حضرات مجتہد معین کی تقلید کو واجب نہیں سمجھتے تھے تو پھر ان بزرگوں کا حنفی ہونا اور حنفی کہلانا کیا معنی رکھتا ہے۔

آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مولانا سید احمد مجاہد، مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ عبدالرحیم دہلوی، مولانا سید عبداللہ، شیخ آدم بنوری، امام ربانی مجدد الف ثانی کے مشائخ بھی حنفی المذہب ہی تھے۔

"سفینۃ الاولیاء" کے مصنف نے لکھا ہے:

خواجہ بہاؤالدین نقشبندی اور اس سلسلہ کے بیشتر مشائخ حنفی المذہب تھے۔

مولانا شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے "مرج البحرین" میں لکھا ہے:

ملت کے تمام اساطین اور طریقت کے سارے ائمہ، فقہاء کے مذاہب کی اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی، امام سفیان ثوری کے مذہب پر عمل پیرا تھے۔ اور شیخ عبدالقادر جیلانی امام احمد بن حنبل کے مذہب پر عمل پیرا تھے۔ اور حضرت شبلی، حضرت مالکی اور حضرت جریری اور حضرت محاسبی، امام شافعی کے مذہب پر عمل پیرا تھے۔ اور ساری دنیا میں مسلمانوں کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ وہ کسی ایک مجتہدِ معین کی تقلید کرتے آرہے ہیں اور یہ بات تاریخی اعتبار سے تواتر کے ساتھ شہرت پاگئی ہے۔ لہٰذا بعض کا یہ قول ہے کہ امام غزالی نے مجتہدِ معین کی تقلید کو سخن بے ہودہ کہا ہے اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایک بے علم عامی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے احکام اور مسائل اخذ کرے۔ امامِ ربانی مجدد الف ثانی، مکتوبات کی جلد اول کے ۲۸۶ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں:

ایک عامی مقلد شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے امام کے مذہب کے خلاف قرآن و حدیث سے احکام اخذ کرے اور ان پر عمل پیرا ہوجائے۔

مولانا شاہ اسماعیل دہلوی نے "مقدمہ ایضاحُ الحق" کی پہلی فصل میں مسئلہ استنباط احکام کی بحث میں لکھا ہے:

احکام و مسائل کے استنباط میں دوسری شرط یہ ہے کہ قیاس کرنے والا شخص مجتہدین میں سے ہونا چاہیے مقلدین میں سے نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر کوئی بغیر کسی قواعد و ضوابط کی پابندی کے قرآن و حدیث سے احکام نکالنا اور بیان کرنا شروع کر دیا ہے اور ہر ایک اپنی اپنی مرضی و خواہش کے مطابق مذہب سازی میں مصروف نظر آرہا ہے اور دینِ متین میں رخنہ ڈال رہا ہے۔

اور بڑی حیرت تو یہ ہے کہ یہ بے علم مقلدین لوگ اپنے حنفی ہونے کا دعویٰ اور اعلان بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مشکوٰۃ شریف میں درج شدہ احادیث سے احکام اخذ کرنے لگے ہیں۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ مشکوٰۃ کے مدون بزرگ شافعی المذہب تھے اور انھوں نے مشکوٰۃ میں زیادہ تر ایسی حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو اُن کے مذہب کی بنیاد ہے۔

اور بڑے دکھ و رنج کی بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ ما بینِ مجتہدین امام شافعی اور امام ابوحنیفہ کے درمیان حکم بنے ہوئے ہیں اور رفع یدین اور وضع یدین نہ کرنے والوں کو بدعتی کہنے لگے ہیں۔

مزید طرفہ یہ بھی ہے کہ یہ لوگ علم تصوّف سے نابلد ہونے کے باوجود علم باطن کے دو جلیل القدر بزرگ شیخ ابن عربی اور مجدّدِ الف ثانی کے درمیان حکم اور ثالث بن بیٹھے ہوئے ہیں اور وحدۃ الشہود کی صحت اور وحدۃ الوجود کے بطلان پر فیصلہ صادر کر رہے ہیں۔ اور بڑے بڑے ہزاروں اولیائے کرام اور علمائے عظام پر حلول و اتحاد کی تہمت لگا رہے ہیں اور ان کو کافر اور ملحد قرار دے رہے ہیں کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

یہ تو بہت بڑی بات ہے جو یہ لوگ اپنی زبانوں سے نکال رہے ہیں اور یہ جو بھی کہہ رہے ہیں سراپا کذب ہی کذب ہے۔

حدیث شریف میں ہے اعمار امتی ما بین ستین و سبعین: میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستّر کے درمیان ہوں گی۔

اس وقت یہ فقیر بہتّر سال کو پہنچ چکا ہے اور لبِ گور بیٹھا ہوا ہے۔ جسمانی قوت جواب دے چکی ہے اور ایک عرصے سے فقہی مسائل اور فقہاء کے اختلاف کی جانب میلان نہیں ہے۔ کیا کریں اسی روش پر یہ زندگی کا کارواں رواں دواں ہے۔

چناں چہ پرورشم می دہند می رویم۔

اس کے ساتھ ساتھ قلیل الفرصت بھی ہوں۔ ایک انار سو بیمار اور ایک سر ہزار سودا کا معاملہ ہے۔ مسائل و احکام کی تلاش و جستجو کی مہلت اور فرصت نہیں مل رہی ہے۔ بہرحال آپ اپنے استفسارات کا جواب مذکورۃ الصدر تفصیلات میں پالیں گے۔ دل میں تو بہت سی باتیں ہیں، جن کی ترجمانی سے زبان و قلم قاصر ہے۔

عمر بگذاشت حدیث دردِ من آخر نشد — شب بآخر شد کنون کوتہ کنم افسانہ را

عمر بیت چکی ہے لیکن میری درد بھری داستان ختم نہ ہو سکی۔ رات ختم ہو چکی لہٰذا میں اپنی کہانی ختم کئے دیتا ہوں۔
اللہ تعالیٰ سے اُمیدوار ہوں کہ وہ دنیا و مافیہا سے جو کہ ملعون خدا ہے فریب نہ کھاؤں گا اور باقی رہنے والی ذات کی محبت و جمعیت سے اپنے مشام کو عطر بیز کرلوں گا۔ زیادہ کیا تحریر کروں۔ حق تمہارے ساتھ رہے۔

مکتوب بنام محمد امین علی خان

سلام مسنون کے بعد واضح ہو

حدیث شریف میں ہے: الناس عیال اللہ واحب الناس الی اللہ من احسن الی عیالہ:
لوگ اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔
ہر چند کہ اللہ تعالیٰ اہل و عیال نہیں رکھتا ہے لیکن جس طرح صاحب عیال کے اوپر اس کے اہل و عیال کے رزق کی ذمہ داری ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی محض اپنے فضل و کرم سے بندوں کے رزق کی ذمہ داری اپنے اوپر لیے ہوئے ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ ہے: وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا؛ مخلوق کے رزق کی کفالت کے لحاظ سے سارے انسان اللہ تعالیٰ کے عیال کے مقام میں ہے۔
اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص بھی کسی کے اہل و عیال کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی کرتا ہے تو وہ صاحب عیال کے نزدیک محبوب ترین بن جاتا ہے اسی طرح مخلوق جو اللہ کے عیال کے مانند ہے' اس کے ساتھ جو آدمی بھی خیر خواہی و ہمدردی کرے گا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین ہوگا۔
فقیر کے رشتہ داروں میں چار صالح لڑکیاں جو علماء و مشائخ عالی مکان اور ائمۂ والا شان اور محبوب سبحانی کی اولاد میں ہیں۔ جن میں سے بعض کی عمر بیس سال سے متجاوز ہے ہنوز بن بیاہ اور ناکت خدا ہیں۔
یہ اطلاع ملی ہے کہ نواب صاحب خالصتہً لوجہ اللہ اس قسم کے کار خیر کو انجام دے رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اجرائے آب اور تعمیر تالاب سے مقصود خار دار درختوں کی پرورش اور پانی کو ضائع کرنا نہیں ہے۔ کسی نے کہا ہے بے حاصل پانی پوری طرح دریا میں چلا جاتا ہے۔ بلکہ اجرائے آب اور تعمیر تالاب سے مقصود ثمر دار درختوں اور دانہ دار زراعت کی پرورش ہے۔ نیز دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے تاکہ ذی استعداد زمین میں بیج ڈالیں اور ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل کرسکیں۔
شادی بیاہ اور دیگر مستحسنات و مشروعات میں روپیہ خرچ کرنا دراصل یہ آخرت کی کھیتی ہے اور یہ عمل بے انتہا برکات کا حامل ہے۔
یہ فقیر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور قرابت داروں کے حق کی ادائیگی کے خیال سے بے تکلف رشتہ داروں کی ضرورتوں

کا اظہار کر رہا ہے۔ ورنہ اس میں اس کی کوئی ذاتی اور نفسانی غرض شامل نہیں ہے۔
اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ وہ آپ کو اپنے عیال (مخلوق) کی خدمت گزاری میں سرگرم رکھے گا اور آپ کو اپنا محبوب ترین بنالے گا اور اس فقیر کو آخرت کے ذخیرہ کی فراہمی میں شریک بنائے گا۔ اور آپ کی وساطت سے کسی تائید کا ظہور فرمائے گا۔ یقین ہے کہ نواب بیگم صاحبہ المعروف بہو بیگم حسن مصرف اور کمالِ استحقاق اور حصول حسنات پر نظر کرتے ہوئے فقیر کے اظہار کو مستحسن خیال کریں گی۔ حاصل کلام! اگر کسی تائید کا ظہور ہو جائے تو بس مویدِ حقیقی حق تعالیٰ ہی ہے اور آپ ماجور قرار پائیں گے۔ اور اگر کوئی تائید بہم نہ پہنچی تو حق تعالیٰ ہی مانع ہے اور آپ معذور ہیں۔
زیادہ کیا تحریر کروں اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت تمہارے ساتھ رہے تم جہاں کہیں رہو۔

مکتوب بنام محمد محی الدین علی خان مہکری

سلام مسنون کے بعد
خدمت شریف پر واضح ہو کہ آپ کا التفات نامہ جو اس مسکین مشتاق کے نام دتھا باصرہ نواز ہوا۔ مسائل شرعیہ کے استفسار سے خوشی ہوی اور آپکے اندر اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کی موجودگی کے علم سے مسرت ہوی۔ این کار دولت است اکنوں تا کرا رسد۔
آپ کی یہ اطلاع اضطراب قلب کا باعث بنی کہ وہاں کے بعض علماء نے بدعاتِ محرم کو جائز کہہ دیا ہے۔ اس خبر کے استماع سے رگِ حیدری پھڑک اٹھی۔ لہذا یہ چند کلمات گستاخہ کی تحریر سے معذور تصور کیجیے۔
مخدوم من!
محرم الحرام کی بدعتوں کی گم راہی اور ضلالت کے بارے میں فریقین (سنّی اور شیعہ) کے علماء متفق ہیں۔ اور کسی نے بھی ان کے جائز ہونے اور ان امور کو انجام دینے کا فتویٰ نہیں دیا ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے بھی اپنی کتاب "تحفۂ اثنائے عشریہ" کے گیارہویں باب کے آغاز میں اسی مفہوم کو بیان کیا ہے:
سبحان اللہ! کیا آج اسلام کا ضعف و انحطاط یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ اہلِ علم بھی ایسی بدعتوں کے احکام جاری کر رہے ہیں اور علانیہ ان بدعات کی توصیف اور تائید پیش کر رہے ہیں۔
دائے نہ یک بار کہ صد بار واے!
"مسلمانانِ در ایتاں شرائع ملوم و مذموم کے معاملہ
ایک بار نہیں بلکہ سو بار افسوس ہے کہ مسلمان دین کے معاملہ میں قابلِ ملامت اور قابلِ مذمت بن چکے ہیں۔ ۵
پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز ! بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

پری سراپا جمال ہوتے ہوئے بھی منہ چھپائے بیٹھی ہے اور دیو ناز و ادا اور کرشمہ دکھا رہا ہے اس برعکس صورت حال سے عقل محو حیرت ہے کہ یہ کیا ابوالعجبی ہے۔

بدعت کو مستحسن نظر سے دیکھنے والے مفتی کو جاننا چاہیے کہ خدا اور رسول ہی شارع ہیں اور کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دین میں جدید قواعد کا ابداع واختراع کرے اور ان کے جائز ہونے کا فتویٰ دے۔ ام لھم شرکاء شرعوا لھم من الدین مالم یاذن بہ اللہ۔ کیا ان کے اور شریک ہیں جنھوں نے دین میں ان کے لیے ایسی نکال دی، جس کی اجازت اور حکم اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔

کل بدعة ضلالة کی حدیث کو لوگوں نے پس پشت ڈال دیا ہے اور اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ تجویز بدعت سے تنقیص شریعت لازم آتی ہے۔ شارع حقیقی اللہ تعالیٰ نے دین کے مکمل ہونے کی خبر دے دی ہے تو پھر بدعت کے اختراع اور ایجاد کی کون سی ضرورت پیش آگئی ہے اور پھر دین کے مکمل ہونے اور نعمت کے مکمل ہونے کا کیا مطلب ہے؟ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناہ
آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے صرف دین اسلام کو منظور فرما کر راضی ہو چکا ہوں۔

بزرگوں نے کہا ہے کسی شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی دنیا و مافیہا کی محبت ہو تو معرفتِ حق اس پر حرام ہے۔
اسی سے قیاس کر لیجیے کہ محرم کی بدعات وخرافات میں کس قدر تضیع اوقات، اتلافِ زر، جدال وقتال، کتاب و سنّت کا تمسخر، مردوں اور عورتوں کا اژدحام، مسکرات اور دیگر لہو ولعب ہے اور یہ تمام چیزیں باطن کو سیاہ اور قلب کو تاریک اور روح کو مُردہ اور اللہ تعالیٰ سے حجاب پیدا کر رہی ہیں۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا
جن اشخاص کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ اپنی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کی وجہ سے آج بدعات کو مستحسن اور مفید خیال کر رہے ہیں۔ کل قیامت کے روز اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ انھیں نقصان وخسران اور حسرت وندامت کے سوا کوئی چیز حاصل نہ ہوگی۔ و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ہ اور ظالموں کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ لڑھکتے، گرتے پڑتے ان کو اوندھے منہ کہاں جاکر پہنچنا ہے۔ ؎

بوقت صبح شود ہمچو روز معلوم مت | کہ باکہ باختہ عشق در شب دیجور

رات کی تاریکی میں کسی شئی کی حقیقت نمایاں نہ ہو تو کیا صبح کی روشنی میں وہ پوری طرح عیاں ہو کر رہے گی۔ اسی طرح روز قیامت اعمال کی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ جن کو تم صالح اور حسنہ تصوّر کرتے رہے۔
اہلِ ایمان نادر ہو چکے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اور بھی نادر ہو جائیں گے۔ اہلِ ایمان کی کمی اور قلت اور غربت واجنبیت کے اس دَور میں سعادت مند شخص تو وہی ہے جو مسلمانوں میں پھیلی ہوی بدعتوں میں سے کسی ایک بدعت کو بھی

ختم کردے اور متروک سنتوں میں سے کسی ایک سنت کو بھی زندہ کر دے اور آخرت کے احوال اور موت کی یاد کو اپنا نصب العین ٹھہرلے۔ اور امر معروف اور نہی منکر کے معاملہ میں مساہلت و مداہنت اور نفاق وکسلان کو جگہ نہ دے اور اخوت اسلامی کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کانوا لایتناھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون جو لوگ ناپسند کاموں کو منع نہیں کرتے تھے بلکہ خود ہی اس میں مبتلا تھے۔ کتنا بُرا فعل تھا جو یہ لوگ کرتے تھے۔

اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ما من قوم فیھم رجلاً یعمل بالمعاصی و یقدرون علی ازالتہ فلا یزیلوہ الا اعمھم اللہ بعذاب قبل ان یموتوا ٥

اُمّت میں ایک شخص بھی گناہوں میں مبتلا رہے اور لوگ اس کو منع کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود منع نہ کریں تو اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو موت سے پہلے عام عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

اصلاح و تذکیر کے باب میں جہاں تک ہو سکے جد و جہد کرنی چاہیے اور اس کام میں دنیا کے طمطراق اور اغنیاء کے تقرب اور لوگوں کے پاس اور نکتہ چینیوں کے خوف کی جانب توجہ نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ چیزیں داعی کے حوصلہ کو پست کر دیتی ہیں اور اس سے دلیری کو ختم کر دیتی ہیں: ۵

اے سرائے وباغ توزندان تو ‌ ‌ ‌ ‌ خان ومان تو بلائے جان تو

اے عزیز! یہ حقیقت نہ بھولو کہ تمہارا گھر، تمہارا باغ اور تمہارا مال یہ سب تمہارے لیے ایک قیدخانہ ہے اور یہ سب تمہارے لیے بلائے جانی ہے۔

اور یہ بات ہمیشہ یاد رکھی جانی چاہیے کہ دعوت و اصلاح اور مدعو کے معاملہ میں ہرگز ہرگز نفس سرکش کا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے اور دشمن کے ساتھ نفرت و حقارت اور عداوت کی روش اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ مبادا کہ عناد پھیل جائے اور کہیں یہ چیز اسلام کے انکار کا سبب نہ بن جائے۔ اور ہمارے اس غلط طرز عمل سے کافروں کی یہ آرزو کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیل جائے، پوری نہ ہو جائے۔

ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انك رؤف رحیم ٥

اے ہمارے رب، ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے، ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ کپٹ اور تنگی پیدا نہ ہونے پائے اے ہمارے رب بے شک تو بڑی شفقت والا اور رحم والا ہے۔

مولانا منجلے شاہ صاحب، عبدالقدوس صاحب، مولانا مفتی قادر علی صاحب، مولانا مفتی زین العابدین صاحب۔ مولانا حکیم غلام نواز خان صاحب، مولانا حافظ میاں صاحب، غلام حسین صاحب اور وہاں کے دیگر بزرگان کرام نیک نہاد اور پاک سرشت ہیں اور مولانا میر محمود نقشبندی جو خرقۂ درویشاں زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ ان حضرات کرام کی جانب رجوع

کریں۔ اللہ تعالےٰ سے امید ہے کہ یہ ذی علم حضرات بدعت و معصیت کو جائز اور حلال کہنے میں خود کو معذور اور معاف خیال نہیں کریں گے۔ اگر یہ دل رکھیں تو ان سے عجیب و غریب فیوضات ظاہر ہوں گے۔ ے

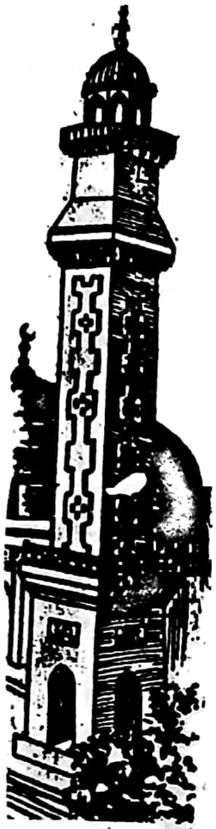
رو بہ خویش خوان و تیرے بین ! تو مرادلدہ و دلبری بین

یہ مسکین ردِ بدعات کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا عزم کر چکا ہے۔ ان دنوں "بدعت نامہ"، "ہدایت نامہ"، "موضو الکبائر و البدعات" کا مطالعہ ہوا، اور یہ کتابیں بڑی اچھی اور مفید معلوم ہوئیں تو ان کی نقل کروا کر آپ کی خدمت میں بھیج دیا ہوں۔ امید ہے یہ کتابیں مقصود کی وضاحت اور مطلوب کی یافت کے لیے کافی ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اللہ کرے آپ کی ذات سے ہدایت اور عدالت کا سلسلہ جاری رہے۔ ٥ء

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

از: رضا الحق آمری

رات تری زلفوں کا اتارا، صبح ترے رخسار کی بھیک
کاسۂ دل، کشکول نظر میں، ڈال دے کچھ انوار کی بھیک
نذر کروں کیا، پاس ہی کیا ہے جاں کے سوا ایماں کے سوا
یہ بھی تری سرکار کا صدقہ، وہ بھی ترے دربار کی بھیک
تجھ سے تجھی کو مانگ رہا ہوں میں ہوں فقیر عجب ڈھب کا
میں تو ترے در سے نہ ٹلوں گا دے کہ نہ دے تو پیار کی بھیک
عارض رنگیں صبح ازل ہے، گیسوئے مشکیں شام ابد
حشر ترے اظہار کا لمحہ، خلد ترے دیدار کی بھیک
ذرّہ میں صحرا، قطرہ میں دریا، پردہ میں جلوہ، عشق میں حسن
لفظ میں معنیٰ، عبد میں مولا، مجھ میں ترے اسرار کی بھیک
صدقہ ملا در کا ترے، جب امید کے سب در بند ہوئے
دھوپ غموں کی تیز ہوئی تو پائی تری دیوار کی بھیک
نعت کہوں سلطانِ زمن کی قدر بڑھاؤں فنِ سخن کی
پائی رضا نے گرانؔ کے کرم سے طرزِ ادا، افکار کی بھیک



جواہر السلوک

چوبیسواں (۲۴) فائدہ

ترجمہ: ڈاکٹر سید وحید اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھوی

حضرت مجدّد مجذوب قطب ویلور علیہ الرحمہ کی معرکۃ الآرا فارسی تصنیف

جواہر السلوک کا مفہوم خیز ترجمہ ھدیۂ ناظرین ھے

"اس فائدے میں نسبت کا بیان ہے لیکن اس میں کلامی مسائل کا بھی بہت زیادہ ذکر ہے جو لوگ علم الکلام سے واقف ہیں وہ کلامی مسائل سمجھ سکتے ہیں۔ جو اس سے واقف نہیں ان کے لیے ان کی وضاحت بے سود ہے۔ کلامی مسائل سے قطع نظر جو لوگ تصوّف سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ان مسائل سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کلامی مسائل کی ضرورت نہیں

مترجم

کتاب 'ہمعات' کے مصنف مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے کلام کا خلاصہ یہ ہے، جب سالک بے نام و نشان ہستی (یعنی ذات بحت) کا کچھ نشان پاتا ہے تو اس کے سامنے دو راستے کھلتے ہیں۔ ایک راستہ جذب کا راستہ ہے اور دوسرا راستہ سلوک کا راستہ ہے۔ یہ مرشد کے اختیار پر منحصر ہے کہ وہ سالک کو پہلے جذب کے راستے سے لے جائے یا سلوک کے راستے سے اور مجذوب سالک کو سالک مجذوب پر جو ترجیح ہے یہ تمام سالکان کے حق میں نہیں ہے کیوں کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ سالک کے سلوک کو جذبہ پر ترجیح حاصل ہوتی ہے اور وہ جذب کے مقابلہ میں سالک کے لیے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے طبعی صلاحیت کے مطابق۔ یہاں جذب سے ہماری مراد صرف یہی نہیں ہے کہ قلب کی کشش غیب کی طرف ہو جائے اور دل کے خطرات رفع ہو جائیں اور عقل اس کی بجا رہے۔ اور شرع کے اوامر و نواہی کا لحاظ رکھے۔ بلکہ ہماری مراد یہاں جذب سے یہ ہے کہ سالک کے وجود سے حجابات اٹھ جائیں اور حقیقۃ الحقائق اس پر عیاں ہو جائے اور ذات احدیت کی طرف اس کا نفوذ ہو جائے۔ خود اپنے وجود کی راہ سے۔ (یعنی یہ خود اس کا حال ہو جائے۔) اور جذب کا حاصل اجزاء کا تحلیل ہو جانا ہے اور حجابات کا اٹھ جانا ہے۔ اور سلوک سے مراد کیفیاتِ نفسانیہ میں سے کسی ایک کیفیت سے نفس

کا رنگ جاتا ہے۔اور وہ کیفیت اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ مثلاً خشوع، طہارت، عشق وغیرہ۔
جذب کی روش یہ ہے کہ جب سالک فی الجملہ عالمِ غیب سے آشنا ہوتا ہے تو اس کو تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ زبانی یا قلبی ذکر میں بہت زیادہ مشغول ہو اور اپنے دل کو آنکھ کو عالمِ غیب کی طرف کھلا رکھے اور اپنے دل کو اسی سے متعلق رکھے۔ ہم کو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو چند روز میں توحید افعالی اس پر منکشف ہو جائے گی اور وہ خود اپنے حال سے نہ کہ عقل سے محسوس کرے گا کہ دنیا اور اس کی تمام حرکات لعبت باز کی طرح ہیں۔ (یعنی جیسے کٹھ پتلی کا ناچ جس میں گڑیوں کو نچانے والا پردے کے پیچھے ہوتا ہے۔) اور دُنیا میں جو کچھ واقع ہوتا ہے اس کا فاعلِ حقیقی ایک ذاتِ واحد ہے اور اگر پہلے ہی سے اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم ہی سے ہوتا ہے تو بہت جلد اس کے آثار اس کے اوپر ظاہر ہو جائیں گے۔ مثلاً اس کے اندر کیفیات توکل و قناعت اور موت و حیات اور شفاء و مرض کو اسباب سے متعلق نہ کرنا بلکہ اسے صرف خدا کی طرف سے سمجھنا۔ (ایسا شخص جس پر توحیدِ افعالی منکشف ہو جائے اور یہ اس کا حال بن جائے نہ کہ محض عقل سے یا عقیدۃً اس پر ایمان ہو' اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ کسی سے انتقام نہیں لے گا، وہ ہمیشہ عفو و درگذر سے کام لے گا۔ قناعت و توکل اس کی روش ہوگی۔ نام و نمود سے ہمیشہ گریز کرے گا: مترجم) ہاں البتہ سنّتِ الٰہی چوں کہ یہ ہے کہ آدمی اسباب کو اختیار کرے تا کہ اس کے اندر قوّت قائم رہے۔ اور اگر پہلے سے اس کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ ہر چیز کا فاعلِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے تو اُسے یہ عقیدہ بہت جلد اپنے وجدان سے حاصل ہو جائے گا اور اس وجدان کی علامات حوادثِ کلّیہ ہیں۔ مثلاً فقر و قناعت شفاء و مرض و موت و حیات اور جاہ و گمنامی ان سب کو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسوس کرے گا۔
لیکن ہر ذرّے اور درخت کے ہر پتّے میں تصرّف کو دیکھ لینا توحید افعالی کی شرائط سے نہیں ہے مگر ایسا بہت ہوتا ہے کہ سالک کو یہ مرتبہ توحید افعالی ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اہلِ ارشاد اس مرتبہ میں سالک کو حکم دیتے ہیں کہ ذکر بہت کرے اور اس بات کو دھیان میں رکھے کہ وجود میں سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی فاعلِ حقیقی نہیں ہے تا کہ جلد از جلد توحیدِ افعالی کے معنی اس پر ظاہر ہو جائیں اگرچہ اس نسبت کا ظہور اس ملاحظہ پر موقوف نہیں ہے۔
صاحبِ توحید افعالی عالمِ ناسوت کو عالمِ غیب کا سایہ سمجھتا ہے۔ جس طرح سے ایک عاقل انسان یہ دیکھتا ہے کہ جسم کے حرکت کرنے سے سایہ حرکت کرتا ہے اسی طرح وہ اس عالم کے حوادث کو غیب کے مدبّروں کو جس کا کہ عالم ناسوت سایہ ہے۔ دیکھتا ہے۔
توحیدِ افعالی کے ظہور کے بعد توحیدِ صفاتی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے مراد تمام مختلف صورتوں میں ایک ذات واحد کا مشاہدہ ہے۔ اور اس مرتبہ میں سالک بداہتہً اس ذاتِ واحد کا مشاہدہ اس طرح کرتا ہے کہ وہی ایک ذات مختلف

صورتوں میں ہے اور اس اصل ذات واحد کو وہ تمام صورتوں میں دیکھتا ہے۔ جیسے وہ انسانِ کلی کو (یعنی انسانیت یا جوہرِ انسان کو) تمام انسانوں میں دیکھتا ہے۔ (کیوں کہ یہ جوہر ناقابلِ تقسیم ہے۔ اس میں تعدد نہیں۔ مترجم) یا شمع کا مشاہدہ مختلف رنگوں میں (یعنی یہ شمع کی لو پر جس رنگ کا شیشہ ہوگا اس کی روشنی اسی رنگ میں ظاہر ہوگی لیکن اس سے شمع کی حقیقت نہیں بدلتی۔ مترجم) اور وہ اس اصل کو بے رنگ سمجھتا ہے اور مختلف رنگوں کو اصل رنگ کے دیکھنے میں مانع نہیں سمجھتا۔ یہ دو مقام (یعنی توحید افعالی اور توحیدِ صفاتی) ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک طویل عمر تک اسی مقام میں رہتے ہیں اور اس جگہ سے ترقی نہیں کر پاتے۔ لیکن جو محبت میں قوی اور ذہن کا تیز ہوتا ہے وہ اس مقام سے اس اصل واحد کی طرف متوجّہ ہوتا ہے اور کائنات کی تمام مختلف صورتوں اور کثرت کی طرف متوجّہ نہیں ہوتا اور ان سب کو دل سے نکال دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ کی یہ سنّت جاری ہے کہ توحیدِ صفاتی، اس اصل کے مشاہدہ سے متعلق ہے۔ انا کے ضمن میں جو کہ ہویّتِ خود سے عبارت ہے پس اس کی نظر انا میں نافذ ہوتی ہے اس اصل تک اور یہاں سے وہ تمام صورتوں کے دیکھنے سے نظر کو پوشیدہ رکھتا ہے اور اس حال کو ہم توحیدِ ذاتی کہتے ہیں۔

ان مباحث میں اگرچہ حد مبحث ذوق الاصل میں ہماری مراد کچھ اور ہے اور وہ برق خاطف کی طرح (لمحاتی) ہے۔ لیکن توحیدِ ذاتی سے مراد وہ مقام ہے کہ سالک جہاں استقرار کرتا ہے۔ (یعنی توحیدِ ذاتی کی کیفیت جب حال پر طاری ہوتی ہے جس میں سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ خود اس کا بھی وجود نہیں ہے تو یہ حال لمحاتی ہوتا ہے۔ جیسے بجلی چمک کر غائب ہو جائے لیکن لمحاتی حال ہونے کے باوجود اس کا تجربہ اسی وقت ہوتا ہے جب سالک اس مقام یعنی توحیدِ ذاتی تک پہنچ جاتا ہے اس لیے اس کو استقرار کہا ہے۔ مترجم)

یعنی سالکان توحیدِ افعالی سے ایک بارگی توحیدِ ذاتی تک پہنچ جاتے ہیں اور توحید صفاتی اور حقیقت الحقائق (جو کہ اصل کا مشاہدہ ہے۔) سے قطعی آشنا نہیں ہوتے اور ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اس نسبت کی تکمیل کے بعد یہ کیفیت مندفع ہو جاتی ہے (یعنی انھیں توحیدِ صفاتی کا بھی شعور ہو جاتا ہے۔) بے نشان کی نسبت سے۔ (یہ نسبت اسی طرح حاصل ہوتی ہے کہ بندہ حقیقت الحقائق یعنی ذاتِ بحت کو بے نام و نشان ہر وقت یاد داشت میں رکھے مترجم) اور یاد داشت اور ذکر خفی کی نسبت سے اور اس حقیقت الحقائق کی طرف اس توجّہ کی حقیقت اجمالی ہے۔ تو اس پر واجب ہے کہ کچھ وقت تک اس مقام پر توقّف کرے اور کامل قطع علایق کر کے کلّی طور پر اس طرف متوجّہ رہے تاکہ اس پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ وہ حقیقت جو مختلف اشکال و صُور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے ایک خاص تعیّن کے ساتھ باقی رہے۔ اور یہاں جذب کی راہ تمام ہو جاتی ہے۔

جب وحدت کی یہ قسم سالک پر منکشف ہوئی اور اس نے جذب کی راہ کو طے کرلیا تو اب وہ توحید وجودی کا معتقد ہوگا یا نہیں ؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے وہ توحیدِ صفاتی تک پہنچتا ہے۔ پھر کچھ مدّت کے بعد اس مقام سے گزر جاتا ہے اور توحیدِ ذاتی تک پہنچتا ہے اور پھر اپنے معاملہ کی توجیہہ اس طرح کرتا ہے کہ پہلے میں مغلوب تھا اور واجب قیّومیت کو ممکن کے ساتھ متحد سمجھتا تھا۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے کوئی خواب میں ایک درندہ دیکھے۔ حالاں کہ وہاں کوئی درندہ نہیں ہوتا بلکہ خود اس کی قوتِ غضبیہ خواب میں درندہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور جب اس مقام سے ترقی کیا اور مقام تنزیہہ میں پہنچا تو تشبیہہ کے ورطہ سے خلاصی محسوس کیا۔ ایک دوسرا شخص ہے، اس نے بھی ایسا ہی خواب میں دیکھا۔ اس نے اس کی توجیہہ اس طرح کی کہ یہ ایک محقّق ہے اور اس پر جو پردہ نظر آتا ہے۔ (یعنی شکلِ درندہ وغیرہ) وہ صرف نظر کا پردہ ہے۔ بہرحال اس پہ سب کا اتفاق ہے کہ اولیاے کاملین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ جو اس راہ سے نہ گزرا ہو۔ البتہ اس کی توجیہہ میں لوگوں میں اختلاف ہے۔

ترجمہ شعر: ہمارے بیانات مختلف ہیں تیرا حُسن تو ایک ہی ہے۔ سارے مختلف بیانات اُسی ایک حُسن کی تعبیریں ہیں لیکن معرفت میں قوی اور ذہن کا تیز آدمی ان کے کلام کا خلاصہ سمجھ سکتا ہے اور اُن کے بیانات کے اختلافات کی توجیہہ کرسکتا ہے۔ اگرچہ ان مقامات پہ کوئی دیر تک رہتا ہے کوئی جلد گزر جاتا ہے۔ اور ہر ایک پر واقعات و احوال کا نزول مختلف طریقہ سے ہوتا ہے۔ ان کی استعدادوں کے مطابق۔ لیکن سلوک کی روش یہ ہے کہ سالک ملکات محمودہ میں سے کوئی ایک ملکہ حاصل کرتا ہے۔ اس طرح سے وہ ملکہ روح کو تمام جہات سے احاطہ کرلیتا ہے اور اسی پر اس کی زندگی اور موت واقع ہوتی ہے: ع

مرے گا تو مبتلا اور اُٹھے گا تو مبتلا

اور ہر حالت جو اس صفت کے ساتھ لازم ہوتی ہے اس کو نسبت کہتے ہیں۔ اس مقام پہ اولیاء کے بہت سے مسلک ہیں۔ یہ فقیر اپنے باطن کے ساتھ عالمِ ارواح کی طرف متوجّہ ہوا اور ہر طبقہ کی نسبت کو جُدا جُدا ادراک کیا اور بطورِ الہام مجھے حاصل ہوا۔ ان اوراق میں ان میں سے کچھ لکھتا ہوں۔

نسبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک وہ ہے جو جذب کی راہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ گویا ظلِّ جذب ہے اور دوسرے وہ کہ اوراد و وظائف کے راستے سے نزدیک تر ہے۔ گویا وہ خلاصہ اور نچوڑ ہے اور بعض سلف اس قسم کو نسبتِ علمیہ کہتے تھے۔ پس جاننا چاہیے کہ سلوک کی قسم کی نسبتوں میں سے ایک نسبتِ طہارت ہے، مثلاً کوئی شخص وضو اور غسل اور خوش بو کے استعمال میں اور جسم اور کپڑوں سے گندگی کو دور کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ اور اپنے اندر خاص سرور، اُنس اور شرحِ صدر محسوس کرتا ہے گو یا یہ اس کی طبعی قوّت ہے، بلکہ یہ سرور اس کی قوتِ ملکیہ کی میراث ہوجاتی ہے

اور اس کا پرتو ہوتی ہے اور اس سبب سے خفیفتِ ملائکہ کی طرف سے اس کے لیے راہ کشادہ ہو جاتی ہے اور وہ ایک بیکراں دریا مشاہدہ کرتا ہے جو ٹھنڈک سے بھرا ہوتا ہے اور دنیا میں یہ شخص ملائکہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور اس کے لیے ملائکہ کو مقرر کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی فلاح کے لیے کوشاں رہیں بطور الہام اور آخرت میں اس کا شمار ملائکہ میں ہوتا ہے اور انھیں میں سے وہ ایک ہو جاتا ہے۔

ان ہی میں سے ایک نسبت سکینیہ ہے، کبھی اسے نور طاعت بھی کہتے ہیں۔ اس کے تین شعبے ہیں۔ ایک شعبہ مناجات میں حلاوت ہے جو اس نسبت کو حاصل کرنا چاہے اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ طویل سجدہ کرے اور دعا و الحاج، استغاذہ اور ذکر و اذکار کی کثرت کرے۔

دوسرا شعبہ شمولِ رحمت ہے۔ جب نفس ناطقہ ملائکہ سے الہام قبول کرنے لگتا ہے تو اس استعداد کے سبب جو اس کی طبیعت میں ہے اور وہ اسے کام میں لاکر مجاہدہ کر کے اسے حاصل کرتا ہے تو لامحالہ اس کے نفس کی قوت کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور بہیمیہ قوت کی بے ہودگی مٹ جاتی ہے اس طرح کی قوت بہیمیہ قوت کسی مَلکی قوت کے رنگ میں رنگ جاتی ہے نہ یہ وہ قوت بالکل معدوم ہو جاتی ہے یا اس میں کمی واقع ہوتی ہے اور انسانی کمالات میں سے یہ ایک بڑا کمال ہے اور جو اس کمال کی طرف متوجّہ ہوتا ہے اس کے سامنے ایک دریائے بیکراں راحت و نزاہت اور قدس بھرا ہوا ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے وہ جتنا زیادہ پیتا ہے اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے۔

تیسرا شعبہ اسمائے الہیہ کے انوار سے رنگ جانا ہے۔ خواہ یہ اسماء بسیط مثلاً یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم خواہ مرکب ہوں مثلاً آیات اور ادعیہ جو صفات واجب تعالیٰ پر دلالت کرتی ہیں جیسے آیت الکرسی، قل ھو اللہ احد، آخر سورۂ حشر۔ عالم مثال میں ان اسماء کے اجسام مثالی قائم ہیں۔ جب ہم نے بہت زیادہ گہرائی سے اس پر غور کیا تو ظاہر ہوا کہ اُن کے جسم کا عنصر مثالی قوت اور ملاء اعلیٰ کا تخیُّل ہے۔ اور اس صفاتِ ذاتیہ و اضافیہ کی روح ہے اور وہ مخصوص سب نُور در نُور ہیں۔

ان ہی میں سے ایک نسبت جو صوفیا کے نزدیک معتبر ہے نسبت اویسیہ ہے۔ اس نسبت میں طبقۂ ملاء اعلیٰ و ملائکۂ علویّہ مدبرہ و طبقۂ ملائکہ ملاء سافلہ و طبقۂ ارواحِ مشائخ صوفیاء من حیث الطبقہ یا فرادا فرادا سب شامل ہیں۔ اس نسبت والے کے لیے ضروری ہے اسے ان ارواح سے محبت و عشق حاصل ہو اور فنا فی المشائخ ہو اور اس نسبت کے ثمرات میں سے ایک اس جماعت کو خواب میں دیکھنا۔ (یعنی مشائخ و ملائکہ وغیرہ) اور ان سے فائدہ حاصل ہونا ہے اور مہالک و خطرات میں اس جماعت کی صورت کا ظاہر ہونا ہے۔

قسم جذب سے جو نسبتیں متعلق ہیں ان میں سے ایک یادداشت ہے۔ اس کی تعریف کے لیے ایک مقدمہ ضروری ہے۔

جاننا چاہیے کہ ہر چیز جس سے کہ ہمارا علم متعلق ہوتا ہے یا وہ مجرّد ہوگی یا متحیّز یا متحیّز سے متعلق۔ اس بارے میں ہمارے علم کا تعلق یہ ہے کہ اس کی صورت شئے کی حقیقت کو منکشف کرتی ہے۔ اور علم کی حالت میں توجّہ یہاں سے گزر کر اس حقیقت سے مل جاتی ہے۔ جیسے نظر عینک سے نفوذ کر کے اس شئے تک پہنچتی ہے جو دکھائی دیتی ہے۔ اور عینک کے وجود کی طرف نظر کی توجّہ نہیں ہوتی یا ایک درخت کا خیال جو نہر کے کنارے ہے جس کا عکس پانی میں نظر آتا ہے اس وقت توجّہ اس خیال کی طرف ہوگی اور پانی کی صورت نظر میں نہ ہوگی۔ یہاں سے قدماء حکماء نے یہ گمان کیا کہ نفسِ ناطقہ کے علم کے نزدیک وہ علم سے متحد ہے اور متاخران نے یہ خیال کیا کہ صورتِ علمیہ عینِ معلوم ہے اور بالجملہ اس صورتِ علمیہ کے انتعاش کے وقت ہمارے ذہن میں دو حالت پیش آتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہماری ساری توجّہ معلوم کی طرف ہو اور اور وہ صورت علمیہ عینک کی طرح ہوگی۔ اس حالت کو علم شئے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہماری ساری توجّہ صورتِ علمیہ کی طرف مصروف ہو اور وہ حقیقت جو التفات تبعیٔ اجمالی ملتفت الیہ نہ ہو۔ اس حالت کو علم العلم کہتے ہیں اور شک نہیں کہ یہ دوسری حالت یا ولی حالات سے زیادہ قریب ہے۔ اور اس کی نگاہداشت حالتِ اولیٰ کے لیے مستعد کرتی ہے۔ اور تجلّی صوری کے ظہور کے وقت اس کے پوشیدہ ہونے پر اس کی خلیفہ ہوتی ہے۔ جب حواسِ ظاہرہ اپنے شواغل سے استراحت پاتی ہے تو وہ صورت روح کی طرف ملتفت الیہ ہوتی ہے اور نصب العین ہو جاتی ہے اور یہ صفت خواب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ بسا اوقات بیداری میں استراحت حواس کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ (اسی کو واقعہ کہتے ہیں۔) اور تجلّی صوری ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ صورت علمیہ ضروری نہیں کہ بدون تشکّل و تکیّف اور تحیّز کے نصب العین نہ ہو بلکہ آدمی کے اندر دو قوّتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک قوت متخیلہ، جو اشیاء کو شکل اور شخص میں ظاہر کرتی ہے اگرچہ وہ خود اپنی ذات میں شکل نہ رکھتی ہو۔ مثلاً قوتِ غضبیہ کو درندہ کی شکل میں دیکھتے ہیں اور قوتِ طمع کو کوّے کی شکل میں دیکھتے ہیں اور قوتِ متوہّمہ کو اشیاء کو معانی پہناتی ہے۔ مثلاً کبھی ہم کسی ایسے شخص کو یاد کرتے ہیں کہ کبھی ماضی میں ہم نے اس کو دیکھا تھا اور پھر اس کی صورت کو نظر میں لانے کے مشتاق ہوتے ہیں اور پہلے ہم اس کو بوجہ جملہ کُلّی کہ جس کا اطلاق ایک سے بہت زیادہ لوگوں پر ہوتا ہے پہچانتے ہیں پھر رفتہ رفتہ وہ شکل ذہن میں حاضر ہوتی ہے جو اُس شخص کی خاص صورت ہوتی ہے۔ اور اسی طرح کبھی ایک حافظ قرآن اجمالاً یاد کرتا کہ فلاں آیت فلاں سورہ میں ہے۔ اس حالت کو صورتِ اجمالی کہتے ہیں۔ کیوں کہ بہت سی آیتیں اس کے مشابہ ہو سکتی ہیں۔ شک نہیں کہ یہاں ہم متحیّز کہ معنی دیتے ہیں جیسا کہ صورت اولیٰ میں ہم معانی کو متشکّل بناتے ہیں۔ اور مفہوماتِ سلبیہ کا ادراک اور کلیات کا انتزاع قوت متوہّمہ کی نیرنگی کے سبب ہے۔

جب یہ مقدمہ واضح ہو گیا تو جان لو کہ جب عارف مجذوب پر بے نشان کا معنی ظاہر ہوا تو کبھی اس طرف اپنی قوی اور تمام جمعیت کے ساتھ متوجّہ ہوتا ہے اور اس کا تمام شعور جو اس کی دراک حقیقت کے تابع ہیں اس کی

قوتِ وہمیہ میں حادث ہوجاتے ہیں۔ اجمالی طور پر اس حقیقتِ بے نشان کی طرف۔ وہاں نہ کوئی شکل ہے نہ صورت نہ وضع لیکن ہستی خاص معنوی ہے اور وہ تجلّی حق ہے۔ قوت متوہّمہ ہیں۔ اس کی مثال ایک صورت ہے جو قوتِ متخیلہ میں حاضر ہوتی ہے اور اس کو وہ خدا کی تجلّی سمجھتا ہے۔ سوائے اس کے کہ یہ تجلّی وہمی ہے اور وہ تجلّی خیال پس عارف اس تجلّی وہمی کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو ہمیشہ نظر میں رکھتا ہے۔ پس اس محافظت کو کشادہ کرتا ہے اور یہ اس کے لیے ایک عظیم راہ اور قوی استعداد مرتبۂ بے نشان کی طرف بخشتا ہے۔ مشائخ صوفیا میں سے وہ پہلے شخص جنھوں نے اس راہ کو طے کیا اور اس طریقہ کو اپنایا اور خود اپنے اصحاب کو اس جانب متوجّہ کیا اور خود کو بطورِ کلّی اس جانب مصروف رکھا اور جو کچھ کہا یہیں سے کہا وہ خواجہ نقشبند ہیں اور اس راہ کو وہ دوام مراقبہ کہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ وجہ خاص ہے۔ ان کے بعد خواجہ عبید اللہ احرار نے راہِ جذب کو مختصر کیا اور دل کا رجحان بے نشان کی طرف اور دل میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہونا اور مستقل اسی کی طرف نگران رہنا، دل کی آنکھوں سے محبت مفرط کے ساتھ۔ اس کیفیت کو راہِ جذب کا اختصار سمجھا۔ پس اس اعتبار سے ایک طریقہ مختصر پیدا ہوا اور اس کی اصل وافاضہ استفاضۂ صحبت ہے۔

اس کے بعد کے زمانۂ دراز گزرا اور وہ کیفیت سینہ بہ سینہ پہنچی تھی اس میں تبدیلی واقع ہوئی اور مرتبۂ بے نشان کی طرف وہ رجحان مفقود ہوگیا۔ اس کے بجائے سالکوں نے اصل ایمان کو نظر کے سامنے رکھا اور یہاں سے انھوں نے اس صورتِ علمیہ کی حفاظت کی اور اسی نسبت کی تکمیل اور اس کی مداومت پر قائم رہے۔ اور اسی سے سمجھا کہ انھوں نے مطلوب پالیا۔ امیر ابوالعلیٰ کے اتباع کے عوام یہی نسبت رکھتے ہیں۔ اس فقیر نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھا اور ان میں سے وہ جو اسم اللہ کی خیال میں محافظت کرتے ہیں ان کی نسبت مناسب تر ہے اور جو اس اسم کو خیال میں نہیں رکھتا ہے تو وہ نسبت اس کے نزدیک اس سے مشابہ ہے کہ کسی کا حواس سکر کی کیفیت سے بھر جائے اور بالجملہ یہ نسبتِ یادداشت اہلِ جذب ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔

اس کا ظاہری ایک کیفیت ہے جس کا مستقر نسمہ میں ہے اور اس سے ملصق ہے اور اس کا بطن صرف کی بے نشانی ہے کہ اُس کی مُدرِک روح مجرّد ہے۔ اور وہ لوگ جو جذب تک نہیں پہنچ سکے اُن کے نزدیک سوائے نسمہ کی کیفیت کے جو کہ غالب ومؤثر ہے کوئی اور وجود نہیں ہے اور اس نسبت کے خواص میں یہ ہے کہ اس نسبت والا عدم کے وجود کے لیے تیار رہتا ہے۔

واز آنجملہ سالک پر قوتِ تاثیر ہے اس طرح کہ ایک نگاہ میں اور ادنیٰ توجہ سے عدم کے وجود تک پہنچ جائے اور ہوش وحواس سے گزر جائے۔

واز آنجملہ ہمّت کی حدّت ہے وہ اس حد تک کہ شخصِ اکبر کے قوتِ عازمہ میں پہنچ جائے اور وہیں سے اُن

کے تصرّفات مثل ہمت کرنا اور مرض کا رفع کرنا اور کشف، اور قلوب پر مطلع ہونا ہے۔

واز آنجملہ نسبت توحید ہے اور اس کی تحقیق کے لیے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔ جان لو کہ زید و بکر و عمرو اور تمام افرادِ انسان مشترک ہیں حقیقت انسانیہ میں اور اپنی فردیّت کی خصوصیت میں ہر ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔ یہ خصوصیات عین انسان نہیں ہیں ورنہ فرق و جمع کا مبداء ایک ہی ہو جائے گا۔ اور یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ اور جمیع وجوہ کی بنا پر یہ غیر انسانی بھی نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہ ہر فرد پر صادق آتا ہے کہ یہ انسان ہے اور وہ خصوصیات صدق انسان سے منع نہیں کرتی ہیں۔ پس یہاں ان خصوصیات اور انسان کے درمیان ایک نسبت خاص ہے۔ جو ظاہریت اور مظہریت میں معتبر ہے۔ پس یہ انسان کالا ہے وہ انسان گورا ہے۔ پہلی صورت میں مظہرِ خاص میں انسان کا ظہور کالے رنگ میں ہے اور دوسری صورت میں گورے رنگ میں۔ یہ مظہر کبھی بالکل ظاہر ہوتا ہے جیسے مادہ اور صورت۔ جس طرح قرع و انبیق میں کہ صورتِ جسمیہ تمام اجسام میں مشترک ہے۔ اول پانی ہے۔ اس کے بعد ہوا ہے اس کے بعد پھر پانی۔ اس صورت میں کوئی یہ نہیں کہتا کہ پانی اور ہوا دوسری چیز ہے جو ایک واحد موضع ہے کیوں کہ اگرچہ صورت جسمیہ اپنی ذات میں متعین ہے اور اس تعیّن میں آب و ہوا کی محتاج ہے لیکن صور نوعیہ میں اس کا ایک مقام ہے اور یہ تکوّن بغیر پانی اور ہوا کے متحقق نہیں ہوتا۔ پس تکوّن کے اعتبار سے اگر ہم انواع کے مرتبہ کا اعتبار کریں تو وہ صورت پانی اور ہوا ہے نہ کہ پانی اور ہوا میں مضموم ہے۔ اگرچہ ایک وجہ سے اپنے موطن میں ضم کا اعتبار بھی ہے۔ پس اس خاص نسبت کا کوئی نام ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کا نام ظہور ہے۔ ظہور کی ماہیت یہ ہے کہ کوئی شئے واحد اپنی ذات میں متحقق ہوا اور پھر دوسرے مرتبہ میں کوئی دوسری چیز ہو۔ اور اس کی مثال نوع کا ظہور ہے۔ اپنے افراد میں۔ یا شمع کا ظہور مسدس و مربع وغیرہ میں اور انسان و گھوڑے کی مثال صورتِ علمیہ میں علم کے ملکہ کے ظہور کے ساتھ اور اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ظہور کے معنی اور اس کے اقسام کا بیان ہماری تصانیف میں سے کسی جگہ معلوم کرنا چاہیے۔

بالجملہ انسان کی صورت اور گھوڑے، گائے، بکری، اونٹ، گدھے وغیرہ کی صورتیں متعین ہیں۔ اپنی ذات میں اپنے مرتبہ کے ساتھ اور اپنے احکام و آثار کے ساتھ محفوظ ہیں اور فردیت کے احکام اور اُن کے آثار ظہور کے محتاج ہیں افراد میں۔

پھر یہ متعینہ محفوظ الاحکام صورتیں حیوان کے مظاہر و تعیّنات ہیں۔ اسی طرح جیسے ہم نے افراد میں بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح پھر امر جوہر و عرض تک پہنچتا ہے اور جب یہاں پہنچے تو خاموش ہو گئے۔ کیوں کہ جوہر و عرض کے درمیان کوئی امر ایسا نہیں ہے۔ بطورِ جنس جس کو موضوع قرار دیا جا سکے اور اہلِ حق نے جان لیا کہ دونوں ایک حقیقت میں متعین ہیں۔ اگرچہ وہ حقیقت تمام حقائق کی طرح کسی خاص احکام و آثار کا نشان نہ رکھتی ہو اور

تمام اسماء میں سب سے زیادہ احق حقیقت وحدانیت ہے جسے ہم کبھی وجود بھی کہتے ہیں اور یہ حقیقی وجود ہے بسیط۔ جس سے دوسرے تعینات متصادم نہیں ہوتے اور دوسری بار جب ہم عالم میں نظر کرتے ہیں تو ہم تمام طبیعی و صناعی مرکبات پاتے ہیں۔ جیسے شجر، حیوان، معادن، تخت، کپڑا اور اس کی مثل۔

بالجملہ حقایق متمیزہ کہ جو آثار کا مبداء ہیں اور جن کو ہم صُوَر کہتے ہیں اور ان سب کا موضوع جسم عنصری ہے تو عناصر و افلاک کی بھی صورتیں ہیں اور ان سب کا ایک موضوع جسم عنصری ہے تو عناصر و افلاک کی بھی صورتیں ہیں اور ان سب کا ایک موضوع ہے صورت جسمیہ میں اور مادۂ اولیٰ جیسا کہ اہلِ اشراق کے نزدیک ہے۔ اور ان سب کا مادۂ قابلہ اور علّتِ فاعلہ وجود کی طرف راجع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

بالجملہ عالم میں ہم سلسلے پاتے ہیں جو مترتّب ہیں اور وجود پر منتہی ہوتے ہیں اور وجود کی مثل ان تعینات کی نسبت ایسی ہی ہے۔ جیسے خطِ سیاہ کی نسبت نقوش کتاب کے ساتھ وحدت کی نسبت مراتب اعداد کے ساتھ وحدت کی نسبت مراتب اعداد کے ساتھ اور یہ تکثّر مثل دریا میں امواج کی طرح ہے۔ پس یہاں دو اصل متحقق ہو گئے ایک وجود اور دوسرے ماہیات۔ اور وجود اور ماہیات میں جو نسبت ہے اس بارے میں عقلاً کی طویل بحثیں ہیں۔ ان سب میں سب سے زیادہ حق مذہب وہ ہے کہ وجود اپنی ذات سے قائم ہے اور صرافت کے مرتبہ میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہے۔ لیکن مختلف ماہیات میں ظہور کرتا ہے۔ جو قالب کے طور پر ہیں۔ ہر وجود اس کے لیے اپنا احکام رکھتے ہیں اور یہ ظہور بہت سی چیزوں پر موقوف ہے۔ اور بعض ظہور کسی دوسری چیز سے مشروط ہے اور یہ کثیر ماہیات سب مترتّب سلسلے ہیں کہ ان میں سے کوئی چیز اپنے موقع و محل سے متقدم یا متاخر نہیں ہو سکتی۔

وجود کا دو کمال ہے ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ اس کی تفصیل ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

حساب داں اعداد کو ذہن میں رکھتا ہے اور یہ استحضار اعداد کے نہ ہونے کے باوجود ہوتا ہے اور حساب دان دس[15] کو طاق نہیں بنا سکتا اور گیارہ کو جفت نہیں بنا سکتا۔ یہ چھ کو پانچ پر مقدم نہیں کر سکتا۔ بالجملہ ہر عدد ایک مرتبہ رکھتا ہے اور اپنا ایک حکم رکھتا ہے اور حساب دان اس میں کوئی تغیّر نہیں کر سکتا اور عقل حکم لگاتی ہے کہ یہ سلسلۂ مترتبہ اپنے نفس الامر میں متحقق ہے اور ان تمام احکام کا منشا وہ سلسلۂ نفس الامریہ ہے اور محاسب کی تاثیر کا قانون وہی ہے اور اس میں کسی کا فعل استحضار اور اس کے ایجاد کے مشابہ ہے وہ ظاہر وجود ہے اور وجود ایک چیز ہے جو دو کمال کا مبداء ہے اور افراد انسان اگرچہ اس میں صور کثیرہ متراکم ہیں۔ لیکن ہر ایک کا ایک خاص حکم ہے کہ عقلِ سلیم اُسے سمجھتی ہے اور بعض افراد میں احکام میں ایک مرتبہ روشن تر و واضح تر ہوتا ہے اور دوسرے افراد میں مخفی ہوتا ہے اور ہر وہ فرد جس میں مراتب عالیہ کلیہ روشن تر ہیں اس کو فنا و بقاء حاصل ہوتا ہے۔ اسی مرتبہ

کے مطابق اس کو علوم حاصل ہوتے ہیں اور وہ فرد جس کے اندر مراتب سافلۂ جزئیہ روشن تر ہے۔اس میں مراتب جزئیہ کے مطابق علوم اور اس مرتبہ کے مناسب احوال غالب تر ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہیے کہ انسانوں کی نوع میں سے بعض افراد میں کہ وجود کا حکم ان میں غالب تر ہے۔ اس لیے وہ وجود میں اشیاء کے اضمحلال کا ادراک کرتے ہیں۔ اور ان کے اندر وجود کے سریان کا ادراک کرتے ہیں کہ اشیاء کا قیام اسی ایک وجود سے ہے اور جو کچھ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں اس مقام سے کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور اگرچہ وہ مراتب خاصّہ کے احکام کو جانتے ہیں لیکن وجود کا سریان ساعت بساعت اس رین کو جلا دیتا ہے اور ایسا کر دیتا ہے کہ گویا نہیں تھا۔ اور اس کے ساتھ دوسرے مراتب ضرورت کے مطابق احکام خاصہ کے ساتھ ذہن میں منقش ہوتے ہیں اور وجودیت کی برق آخرکار جل جاتی ہے اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ نفس کو اس کے ادراک کا ملکہ ہو جاتا ہے۔ اور اس رنگ میں رنگ جاتا ہے اور کاملان کے نزدیک اس رنگ کا ظاہر اور باطن ہے۔ ظہر وہ رنگ ہے جو نسمہ سے قائم ہے اور یہ ایک ملکہ ہے۔ جس کا مستقر وہاں ہے۔ لیکن بطن وجود کا ایک نقطہ ہے اپنے احکام و آثار کے ساتھ اور اس کے احکام کا ظہور ہے۔ اس میں سارے پردے مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس ادراک کے مطابق اور ناقصین کے نزدیک یہی ظہر ہے۔ بغیر بطن کے اور یہی صورت ہے بغیر معنی کے۔ اس مقدمہ کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی یہ شخص اپنے فکر کے ضرب سے یا عارفوں کی تقلید میں پختہ ارادہ کرتا ہے، اس بات کا کہ ساری اشیاء وجود میں مضمحل ہیں اور وجود ہر شئے میں ساری ہے اور ساعت بساعت خیال کو وہ مستحضر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے نفس میں اس خیال کا ملکہ پیدا ہو جاتا اور اسی خیال سے رنگ جاتا ہے۔ حالاں کہ وجود کا صرف نقطہ منقّط ہوا ہے اور اس نے اپنی کشش اور کوشش کو اس مرتبہ تک نہیں پہنچایا ہے کہ وہ نفس شئے کی اصل تک پہنچ جائے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک تالاب میں بہتا ہوا پانی جمع ہو جائے اور اس تالاب میں زمین سے کوئی چشمہ نہ نکلتا ہو۔ اسے صوفیا توحیدِ علمی کہتے ہیں اور اول کو توحیدِ حالی۔ اس فقیر کو آگاہ کیا گیا ہے۔ کہ توحیدِ علمی ان نفوس کے لیے نافع نہیں ہے جس کا تزکیہ نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ یہ مُضر ہے۔ کیوں کہ یہاں سے عقیدۂ سوفسطائیہ جنم لیتا ہے اور شرعی امور کی انجام دہی میں تساہلی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن توحیدِ حالی ایک بڑا کمال ہے کہ زبان اس کی شرح سے تلرصر ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یّشاء۔

الغرض الجملہ حالاتِ عشق میں اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب مومن حق تعالی کے اوصاف پر کامل یقین رکھتا ہے اور اپنے کمال کو اسی کی یاد میں منحصر دیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ حق تعالی کے نام کو ہمیشہ یاد کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کو ملاحظہ کرتا ہے تو اس پر مداومت آہستہ آہستہ اس کے دل میں بے قراری، اضطراب اور قلق کی صفت پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ اضطراب روز بروز بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حق تعالی کا نام زبان پر نہیں لا سکتا۔

کہ کہیں اس کی روح جُدا ہو جائے۔ (نام لینے سے)

بالجملہ جب روح میں یہ کیفیت متمکّن ہو گئی اور دل کے جوہر میں پیوست کر گئی اور نفس اس سے رنگین ہو گیا تو اس کو نسبتِ عشق کہتے ہیں۔ کاملینِ اہل فنا و بقاء کے نزدیک اس نسبت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اس کا ظاہر ایک کیفیت ہے جو نسمہ میں مستقر رکھتا ہے مثل تمام کیفیاتِ نفسانیہ کے اور اس کا ایک بطن محبتِ ذاتیہ ہے۔ جو اس نفسِ منفرد کا حامل ہے۔ بلکہ روح کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح مٹی اور پانی کا میلان نیچے کی طرف ہے اور ہوا اور آگ کا میلان اوپر کی طرف ہے اسی طرح ہر موجود محسوس و معقول کے اندر کوئی کمال رکھا ہے جس کا کہ وہ مشتاق ہوتا ہے اور جب تک وہ اسے نہ مل جائے قلق و اضطراب کی حالت رہتی ہے۔ جب وہ مل گئی تو اس سے اس کو الفت و انس ہو جاتی ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے کثرت کو اپنی اصل یعنی وحدت کی طرف میلان و طیران ہے اور مظہر کو ظاہر سے ارتباط ہے اور یہاں کسی حالت یا نعمت کا حصول مقصود نہیں ہے اور وہ نعمتوں کے تذکّر کا خواہش مند نہیں ہوتا اسے محبت ذاتیہ کہتے ہیں۔ پس یہ مستقل کیفیت نسمہ میں متصل ہو جاتی ہے۔ محبتِ ذاتیہ کے ساتھ۔ اور ایک حقیقت ترکیب پاتی ہے جس کا جسم نسمہ کی کیفیت ہے اور اس کی روح محبت ذاتیہ۔ اس کیفیت والا ان دو چیزوں میں فرق نہیں کر سکتا۔ یہاں سے صوفیاء کے دو قوال کو جمع کرنا معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ قلق و اضطراب ایک عذاب ہے واصلِ محبوب کو کیوں دیتے ہیں؟ اور بعض کہتے ہیں کہ عشق و قلق کی کوئی حالت سالک سے مرتفع نہیں ہوتی نہ اس جہاں میں پس پہلے قائل کے اشارے کا مقصد قلق و اضطراب نسمی ہے اور دوسرے کا مطمع نظر محبتِ ذاتیہ۔ لیکن چوں کہ اکثر عارفوں کے حق میں یہ ہر دو اختلاط و امتزاج رکھتے ہیں اس لیے ان کو ایک دوسرے سے بالکل متمیّز کرنا متحقق نہ ہوا۔

یہاں دو نکتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے ایک یہ کہ اگر عارف کی محبتِ ذاتیہ ضعیف ہو، خواہ تمام اشیاء میں محبوب کی سریان کی رویت کے سبب ہو، یہ اس کے حق میں نقصان دہ ہے۔ خواہ وہ کسی مرتبہ میں ہو۔ دوسرے یہ کہ ترک و تجرید دُنیا و آخرت سے اور اہل و عیال کی فکر سے بے پرواہ ہو جانا۔ خواہ اس کے اندر مزاج کی استقامت اور وفورِ عقل ہو۔ نسمہ کی اس کیفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہ نسبت والا تمام ما سوا پر تسلّط رکھتا ہے۔ اور سب سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ اس لیے اسے جو بھی دیکھتا ہے اس کے سامنے فروتنی کرتا ہے۔

از آنجملہ نسبت وَجد ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس ناطقہ اپنی اصل فطرت میں ایسا واقع ہوی ہے کہ مختلف حالات میں مختلف کیفیتوں سے رنگ جاتی ہے۔ مثلاً شوق، نفرت، غصّہ، خوف و رجا اور بعض کیفیات قدسی اور ملکی ہیں اور بعض دَنسی اور بہیمی اور ایک استعداد کو اس سے متناقض استعداد محو کر دیتی ہے اور ہر ایک کے اسباب ہیں اور

متقویات ہیں۔ جب سالک اپنی محنت کے ذریعہ یا الٰہیہ یا ملکیہ حالات سے مستفید ہوتا ہے تو اس کا نفس اسی قبیل کی استعداد سے قوت پکڑتا ہے اور ایک ادنیٰ سا محرک بھی جسے عرف عام میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اس کے نفس میں تاثیر بلیغ کرتا ہے۔ اور کبھی آدمی موٹی عقل کا ہوتا ہے اور اس کے نفس میں جوش نہیں ہوتا اور نہایت لطیف کیفیات کا اثر اس پر بالکل نہیں ہوتا اس حالت میں وہ عشق عفیف (یعنی پاکیزہ عشق) کا محتاج ہوتا ہے کہ جہاں شہوت جماع کا گزر نہ ہو بلکہ متناسب حرکات اور رنگین عبارتیں اس پر اثر کرتی ہیں اور پھر یہاں سے اسے وصال کے اُنس سے فراق کی وحشت تک پہنچانا اور محبوب کی ناز و ادا کے بعد اس کا اعراض کرنا تاکہ اس کے اندر انقباض پیدا ہو اور اس طرح کی دوسری چیزیں یا رنگین شعر کا سننا اور اگر راگ راگنی جس میں شوق انگیز استعارے اور قوافی ہوں (ان ذرائع سے اس کے اندر جوش پیدا کیا جاے۔)

شعر: یہ راہ جاننے والا گویّا کیسا راگ الاپتا ہے کہ غزل کے درمیان وہ راز دار کی بات سنا رہا ہے۔ اور طنبور و رباب کا بجانا جس کی آواز شراب اور نشہ کا کام کرتی ہے۔ وقتاً فوقتاً نفسِ ناطقہ میں خاص کیفیت پیدا کرتی ہے اور ساعت بساعت وہ ان کیفیات سے متصف ہوتا ہے اور اس کی بلادت بطور کُلّی زائل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی طرف جمہور اہل وجد راغب رہے ہیں۔ (حضرت قطب ویلورؒ نے قادری مسلک کے اعتبار سے وضاحت کی ہے۔ ورنہ چشتیہ سلسلہ میں سماع ایک ایسی روحانی غذا ہے جس کے گرویدہ اغواث واقطاب رہے ہیں۔ مترجم)

لیکن جو کچھ شارع علیہ السلام نے اس بارے میں سالکین کے لیے اختیار فرمایا ہے:

وہ وعظ کا سننا ہے، قرآن کی تلاوت ہے معانی میں تدبّر کے ساتھ، اور رحمت کی آیات کے وقت طالبِ رحمت ہونا اور عذاب کی آیات کے وقت استعاذہ، تسبیح اور آیات صفات اور احادیث کا استحضار وغیرہ، اور حقیقت میں طبیعت کا جوش اور تہیّج ان امور میں محصور نہیں ہے۔ بلکہ کبھی دریا کا جوش و خروش دیکھنا اور بعض بار یک مضامین وجد لاتے ہیں۔ اور کاملین کے نزدیک اس نسبت کا ایک ظہر ہے اور ایک بطن۔ اس کا ظہر کیفیات نفسانیہ ہے جس کا مستقر نسمہ ہے اور اس کا بطن لطیفۂ مجرّدہ کا ایک مفرقت سے دوسری معرفت کی طرف بڑھنا۔ خواجہ نقشبند اس کو قبض و بسط کہتے تھے۔ بالجملہ جمہور نے اس نسبت کو غالباً سماع و وجد پر محمول کیا ہے۔ اور اہلِ فنا و بقاء سے اسی نسبت کے سبب استعدادِ معارفِ جلیلہ منشعب ہوتے ہیں کہ زبان اس کی شرح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ امام الانام حجۃ الاسلام ابو النجیب عبد القادر سہروردی در رسالۂ آداب المریدین در ذکر اختلاف سالک سالکانِ طریقِ حق فرماتے ہیں کہ مقصود ایک ہے اور مقاصد مختلف، قاصدین کے حال کے اختلاف کے سبب اور سالکین کے مقامات کے سبب، تو

۱۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے عبادات کا راستہ اختیار کیا اور محراب و مسجد کو لازم پکڑ لیا اور کثرتِ ذکر و نوافل میں مشغول ہو گئے اور اوراد و وظائف پر مداومت کی۔

۲۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے عُزلت وخلوت کا طریقہ اختیار کیا تاکہ وہ عوام کی مخالطت سے محفوظ اور سلامت رہیں۔

۳۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے سیر و سیاحت اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کا طریقہ اختیار کیا اور ہمیشہ ذکر میں مشغول رہے۔

۴۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے ریاضت و مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا۔ نفس کے خلاف کام کرنے پر۔

۵۔ ان میں سے کچھ ہیں جنھوں نے خلق کے سامنے جاہ کو چھوڑنے کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے بھائیوں کے لیے جاہ کو چھوڑنے اور ان کے دلوں کے خوش کرنے کا۔

۶۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے مجاہدہ کا طریقہ اختیار کیا اور رکوب الاہوال کا اور مباشرۃ الاحوال کا۔

۷۔ اور ان میں سے کچھ ہیں جنھوں نے خلق کے سامنے جاہ کو چھوڑنے کا طریقہ اختیار کیا اور ان کی طرف تعلّق التفات اور ان کے خیر و شر کے مشغلوں سے دُور رہنے کا

۸۔ ان میں سے کچھ ہیں جنھوں نے تعلّم کا طریقہ اختیار کیا اور دینی سوال کرنے کا اور علمار کی مجلس میں بیٹھنے کا اور احادیث سننے کا اور علم سیکھنے کا اور ہر طریقہ محتاج ہے۔ کسی رہبر کا جس سے سیکھا جائے۔

۹۔ ان میں سے کچھ ہیں جنھوں نے عجز و انکسار کا راستہ اختیار کیا کما قال وآخرون اعترفوا بذنوبهم خلطوا عملاً صالحاً وآخر سيئاً۔ آن يتوب عليهم : (سورۂ توبہ)

بعض مشائخ نے کہا: فلاں نے رُجعت کی پھر کہا ہم نے کسی کو رُجعت کرتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے اس کے کہ وہ رہبر کی توفیق سے محروم رہا۔

ان مسالک کی تفصیل آداب المریدین کی شرحوں خصوصًا شرف الملّت والدین احمد بن یحیٰی منیری اور قدوۃ العارفین سیّد محمد گیسو دراز حسینی رح میں دیکھنا چاہیے۔

ص 93 کا بقیہ

بقیہ "انشائے عقائد ذوقی" خلفائے راشدین کے نادر فضائل اور کرامات

زبان کی کیا مجال کہ اپنی ناقص قوتِ گویائی کے ساتھ ان کے کمالات کا اظہار و بیان کر سکے۔

والسلام

قسط ۱۱

جواہر الحقائق

گیارھویں قسط

تصنیف لطیف ماہر علوم دین طریقت، واقف رموز معرفت وحقیقت، حافظ قرآن، مجذوب حضرت شاہ محی الدین سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہ العزیز المتوفی سنہ ۱۲۸۹ھ

لوادر الدقائق ترجمہ جواہر الحقائق

ترجمہ وتشریح

حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر سید افسر باشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی۔ شفاء ڈسپنسری گرمیاتم

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ

حمد تیری اے خدائے لم یزل
ہے یہ اپنی زندگی کا ماحصل
نام تیرا میرے دل کی ہے دوا
ذکر تیرا روح کی میری شفاء

جب زباں پر محمدؐ کا نام آگیا
دوستو زندگی کا پیام آگیا
آپ کی مدح انساں کیا کرسکے
عرش سے جب درود و سلام آگیا

ہر قسم کی تعریف ثابت ہے اس پاک پالن ہار کے لیے جو ساری کائنات کا خالق و پروردگار ہے اور ہزاروں ہزار بار درود وسلام اس دربار گہربار، خلاصۂ کائنات، فخر موجودات، محسن اعظم، فخر آدم، نور مجسم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن کے طفیل وبدولت اسلام کا بول بالا ہوا اور شرک وضلالت، کفر وجہالت کا منہ کالا ہوا۔

الحمد للہ! زیرِ نظر کتاب "نوادر الدقائق" ترجمہ "جواھر الحقائق" کی یہ گیارھویں قسط ہم آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ جو کتاب جواھر الحقائق کے فائدہ نمبر پانچ (۵) کے بقیہ حصہ کا ترجمہ ہے۔

اس ترجمہ کے تعلق سے عرض ہے کہ اس کے اندر اتنی رعایت اور کوشش کی ہے کہ ترجمہ لفظی اور بامحاورہ ہو، اور جہاں عبارت دقیق اور مشکل ہوتی ہے وہاں عبارت کا خلاصہ یا حاصلی ترجمہ کر دیا ہے۔ پھر بھی بعض مشکل اور ادق الفاظ کے افہام و تفہیم کے لیے دشواری محسوس ہوتی ہے تو حتی الوسع قوسین کے اندر اس کی تسہیل کر دی ہے۔ جو راقم الحروف مترجم کی طرف سے خفیف اضافہ اور فائدہ ہے۔ اور جہاں تشریح کا مستقل عنوان ہے، وہاں مترجم کی جانب سے تفہیم و تشریح کی ایک ادنیٰ کوشش سمجھیں۔

زیرِ نظر کتاب نوادر الدقائق ترجمہ جواھر الحقائق کی یہ گیارھویں قسط الحمد للہ! درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے:

۱۔ عالمِ ارواح کا وجودِ خارجی۔
۲۔ وجودِ علمی۔
۳۔ وجودِ لفظی۔
۴۔ وجودِ کتابی۔
۵۔ تفصیلِ وجودِ خارجی۔
۶۔ عالم الملک
۷۔ عالمِ ارواح، عالمِ مثال، اور عالمِ اجسام
۸۔ آئینۂ وجودِ مُبَسط۔
۹۔ تعیّناتِ عارضی۔
۱۰۔ اشیاے وجودی۔
۱۱۔ اعیان کا غیبِ علمی۔
۱۲۔ اشیاء وجودی کی حدبندی، درجہ بندی اور مراتب
۱۳۔ عالمِ اجسام کے نائبین۔
۱۴۔ انجامِ عالَم۔
۱۵۔ شہودِ عیانی۔
۱۶۔ دھرم اپنا اپنا خیال اپنا اپنا۔
۱۷۔ تشریحِ مترجم۔
۱۸۔ مُلحدین کی خُدائی۔
۱۹۔ جاہلوں کا شرکِ خفی اور بدعات و خرافات۔

پچھلی دسویں قسط میں صاحبِ کتاب حضرت قطب ویلور نور اللہ مرقدہ نے "رسالہ قضاو قدر" کے حوالہ سے اس پر بڑی تفصیلی بحث فرمائی تھی کہ بعض کم فہم کوتاہ نظر اللہ کی شان میں گستاخی کرنے لگتے ہیں کہ اس نے ہمیں غریب و کم زور ضعیف و مزدور بنا رکھا ہے اور دوسروں کو اونچے اونچے عہدے اور مراتب عطا کئے ہیں۔ جب کہ یہ دونوں مراتب اونچ نیچ، برتری اور ابتری اپنی جگہ ضروری ہیں۔ جس طرح دنیاوی پادشاہت اور مملکت کے لیے اعلیٰ عہدہ اور ادنیٰ عہدہ، اونچی پوزیشن جیسے وزیر و مُشیر اور نچلی و حقیر پوزیشن جیسے مہتر و چپراسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ کے دربار اور اس کی مخلوقات میں بھی اونچ نیچ، برتری و ابتری کا ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ اب آگے ارشاد فرماتے ہیں:

علمی مراتب کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) وجودِ خارجی۔ ۲۔ وجودِ علمی۔ ۳۔ وجودِ لفظی اور ۴۔ وجودِ کتابی۔

۱۔ عالمِ ارواح کا وجودِ خارجی

پس اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ علمی مراتب کا ان ہی کوئی مراتب میں ایک خارجی وجود بھی ہے عالمِ ارواح ہیں اور یہ وجود جس کے مراتب کا ظہور عالمِ ارواح میں بھی اور عالمِ مثال میں بھی ہوتا ہے۔ نیز اس کے مراتب کا ظہور جسدی صورت میں حس کے ساتھ محسوس ہوتا ہے (مگر حسِ ظاہر کے ساتھ نہیں (صوفیائے کرام جسدی صورت کو اکثر مثالی صورت سے تعبیر کرتے ہیں۔)

عالمِ حس میں مراتب کے ظاہر ہونے کا وجود، حسِ ظاہر میں، نیز انسانوں میں وجود اسی معنی میں ہے۔ اور یہ وجود عینی محال کو کبھی قبول نہیں کرتا۔

۲۔ وجودِ علمی

وجود علمی وہ ہے جس کے مراتب کا وجود علم سے بھی اور ذہنوں سے بھی ہوتا ہے۔

۳۔ وجود لفظی

اور وجود لفظی وہ وجود ہے جس کے مراتب کا ظہور وقوع لفظوں سے بھی اور زبان و بیان سے بھی ہوتا ہے۔

۴۔ وجودِ کتابی

وجود کتابی وہ وجود ہے جس کے مرتبوں کا اظہار کتابت سے ہوتا ہے۔ اور اسی طرح نقشوں اور تختیوں سے بھی ہوتا ہے۔

(بہر حال) وجود علمی، وجود لفظی اور وجودِ کتابی (اپنے ظاہر وجود کی وجہ سے) تفصیل (و تعریف) سے مستغنی ہیں (یعنی یہ خود ظاہر ہیں۔ ان کی مزید تفصیل کی حاجت و ضرورت نہیں ہے۔)

تفصیلِ وجودِ خارجی

(ہاں) وجودِ خارجی کی (البتہ کسی قدر) تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ جس چیز پر حسّی اشارہ نہ ہوتا ہو اس کو عالمِ علوی، عالمِ ارواح، عالمِ امر اور عالمِ ملکوت کہتے ہیں۔

اور ہر وہ چیز بھی جو نظروں سے اوجھل ہو اسی معنی میں ہے۔

اور جس چیز پر اشارۂ حسّی ہوتا ہے اسے عالمِ سفلی، عالمِ اجسام و اعراض، عالمِ خلق اور عالمِ ملک بھی کہتے ہیں اور اسی طرح ہر وہ چیز بھی جو نظروں میں آسکے وہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے (یعنے وہ بھی اسی مطلب میں ہے۔)

۔یہاں امر و خلق سے مُراد قرآن مجید کی آیتِ کریمہ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا ہے جو ان دونوں عالم سے متعلق ہے۔ (پھر) وہ عالم جو انِ دونوں عالموں کے درمیان واسطہ بنے اور وہ مُجرّد نُورانی بھی ہے اور محسوس مقداری بھی اور جسے بساطت (وسعت) اور جسامت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے برزخِ جامع اور مثالِ مُطلق کہتے ہیں۔

موجودات کا مُوجِد (یعنے ذات حق تعالےٰ شانہٗ) نے اوّل عالمِ ارواح کو، دوّم عالمِ مثال مطلق کو سوّم عالمِ اجسام کو خارجی وجود بخشا۔

بہر حال عالمِ ارواح یہ عالمِ انسانِ موجود کا مظہر ہے اور عالمِ مثال یہ عالمِ ارواح کا مظہر ہے اور عالمِ اجسام، یہ

عالمِ مثال کا مظہر ہے۔

عالَمُ المُلک

(علامہ) قیصریؒ "شرحِ فُصوص" کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

عالَم المُلک یہ عالمِ ملکوت کا مظہر ہے اور یہی عالمِ مثالی مطلق ہے اور یہی مظہر عالمِ جبروت بھی ہے۔ یعنے عالم المجرّدات (یہاں عالمِ جبروت اور عالمِ ملکوت کی طرف اس بات کا اشارہ ہے کہ ان کا دوسرا معنیٰ بھی ہے۔) یہ اعیانِ ثابتہ (موجودہ انسان) کے عالم کا مظہر ہے اور یہ اسماءِ الٰہیہ اور حضرت الواحدیّۃ کا بھی مظہر ہے، پھر یہ مظہر الواحدیہ، حضرت الاَحدِیّۃ کا مظہر ہے جو بزرگی کو شامل ہے۔

انسانوں کا سایہ ارواح ہوتے ہیں اور ارواح کا سایہ اجسام و بدن ہیں۔ پھر یہ انسان حق تعالےٰ کے ناموں کے سایہ ہوتے ہیں۔ گو کہ اسماء ذاتِ مُطلق کا سایہ ضرور ہیں۔

عالمِ ارواح، عالمِ مثال اور عالمِ اجسام

اسی طرح عالمِ ارواح مُجرّدِ بسیط ہے اور عالمِ مثالؔ یہ مُجرّد کے ساتھ مُرکّبِ لطیف ہے۔ اور عالمِ اجسام یہ مادّی اور مرکبِ کثیف ہے۔ اور اسی طرح عالمِ ارواح معقول ہے اور آثار و علامات سے پہچانا جاتا ہے اور عالمِ مثال یہ مُتخیّل ہے اور خیالوں کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔ اور عالمِ اجسام یہ محسوس ہوتا ہے اور حواس کے ساتھ پہچانا جاتا ہے۔

(پس (یہاں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ) ارواح کو پہچاننے والی چیز عقل ہوتی ہے اور عالمِ مثالِ مُطلق کو پہچاننے اور سمجھنے والی قوت خیالِ مطلق ہے۔ اور (عالمِ) اجسام کو پہچاننے کا ذریعہ حواس ہے۔ غرض یہ (تینوں) خارجی موجودات حسّی، خیالی اور عقلی مراتبِ ثلاثہ سے خارج (الگ) نہیں ہیں۔ ھ

آں رُتب چیست حس و روح و خیال؟ ہر یکے عالمے باستقلال

یعنے وہ حس روح اور خیال کے مراتب کیا ہیں؟ وہ یہی ہیں کہ ان کا ہر ایک بھی اپنے اندر ایک مستقل عالم رکھتا ہے۔

جب ارواح معقول ہوتے ہیں تو ان کے فوقانی مراتب بھی انسانوں سے، ناموں سے اور شان و شوکت سے اور ذات کے اعتبار سے بطریقِ اولیٰ معقول ہوتے ہیں۔

آئینۂ وجودِ مُنبسِط

جان لو کہ فوقِ مشیّت کے مُبسط وجود کے آئینہ میں حق تعالےٰ شانہٗ کی علمی صورتوں، شکلوں کو موجودہ انسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (یعنی یہ انسان حق جل مجدہٗ کی صُورِ علمیہ کا نام ہے۔) اور پھر ان صورتوں کو گو کہ یہ بے شک مظاہر کونیہ تو ضرور ہیں لیکن انھیں علم اور صور علمیہ حاصل نہیں ہے۔

(یہ بات تو فوقُ المشیّت کی تھی) اب مظاہرِ کونیہ میں تحتُ المشیّت علمی صورتیں عقلِ کل کو جو علمِ ثانی کے مرتبہ میں ہیں، عالمِ معانی کہا جاتا ہے۔ اور انھیں سوچنے اور سمجھنے سے کوئی (واسطہ) اور سروکار نہیں رہتا۔ (اور یہ حق کی طرف رہنمائی کا مادہ نہیں رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے) نفسِ کل کی علمی صورتیں ہیں۔ جنھیں عالمِ ارواح کہا جاتا ہے۔ انھیں تدبیر و تصرف

کے جواز کی قابلیت و صلاحیت موجود ہے۔ جو آگے پیش آنے والے امور و معاملات (بدرجۂ اتم) کام کرتے ہیں۔

اور ارواح کی علمی صورتوں کا دوسرا نام عالمِ مثال بھی ہے۔ اور عالمِ مثال کی علمی صورتوں کو عالمِ شہادت بھی کہتے ہیں۔ پھر عالمِ شہادت کی یہ علمی صورتیں جو اپنی قوتِ خیال کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ اقوال، افعال، عقائد اور اعمال کہلاتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب "سبحات" میں موجود ہے۔

تعیّناتِ عارضی

جان لو کہ عارضی تعیّنات یا تو علمی تعدد رکھتے ہیں یا وجودی تعدد۔ پھر علمی تعدد کو علمی اعیان اور ثبوتی اشیاء کہتے ہیں۔ اور وجودی تعدد کو خارجی اعیان اور وجودی اشیاء کہتے ہیں۔ غرض یہ ثبوتی اشیاء میں وجود کی قسم میں سے ہونے کے باوجود ظلمت و تاریکی ہے۔ اور اشیاء وجودی میں نور ہوتا ہے اگرچہ اشیاء ثبوتی میں ثبوت و ظہور کی حالت میں غیبِ علمی کی ظلمت میں پوری طرح مکمل ظہور نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی نہیں ہوتا۔ اور احکام و علامات اور آثار سے بھی اس کی علامت ظاہر نہیں ہوتی۔ نہ تو اپنی ذات سے خود کو پہچنواتا ہے اور نہ اپنے سے پیدا ہونے والی یا پیش آنے والی علامات سے پہچنواتا ہے۔ اور نہ ہی بعض کو بعض سے پہچانا جاسکتا ہے۔ اور انہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے علم کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔

نیز خارجی طور پر بھی ان کا ظہور نہیں ہوتا جس طرح ہماری معلومات میں ظاہر بات ہے کہ اشیاء کا ظہور خارج میں (باہر میں) اپنے وجود کے نور سے ہوتا ہے۔ (اور اگر یہ وجودی نور نہ ہو تو ظلمت و تاریکی ہی ہوگی۔) چناں چہ تمام اشیاء آفتاب کے نور (اور روشنی) سے (روشن) و ظاہر ہیں۔

اشیاء وجودی

غرض اشیائے وجودی، خارجی وجود کے مراتب میں خود اپنے نفس پر اور خود سے پیدا ہونے والے حالات سے بھی آگاہ اور مطلع رہتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارے روحوں کا معاملہ ہے کہ بعض سے بعض کو پہچانا جاتا ہے اور ہمارے دلوں میں بھی پایا جاتا ہے اور ہم اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ اپنی مثالوں میں اور جسموں میں۔

جب انسان اپنے نفس پر اعتبار و بھروسہ کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اپنی روح میں کچھ معانی اور مطلب اجمالاً موجود ہے اور اس مقام پر (آپس میں) بعض بعض سے جدا اور تمیز کرنے کی (پوری صلاحیت) نہیں رکھتے۔ (وہ اندر مختصر معلومات رکھتے ہیں، انھیں) اپنی اس روح میں ان معانی اور مطالب کا تفصیلی شعور و احساس نہیں ہوتا اور ایسی (پریشان کن) ہنگامی صورتِ حال میں اسے اجمالی شعور کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

اور جب (انسان) اپنے دل میں جدائی اور دوری محسوس کرے اور ہر ایک بھی ان معانی اور مطالب سے خیالی صورتوں میں سے کوئی ایک صورت و شکل کے قریب ہو اور وہ چھپے ہوئے پوشیدہ ہوں اور بعض بعض سے (ایک دوسرے سے) الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتے ہوں تو ایسی ہنگامی صورت میں اسے تفصیلی شعور و ادراک کی طاقت ہوتی ہے۔

پھر جب اپنے خیال میں کوئی بھی ان معنوں اور مطلب سے ظاہر ہو اور خیالی صورت میں مخفی اور پوشیدہ ہو اور ان ہنگامی حالات میں اپنے ہی مانند محسوس ہو اور اس کے خیال میں موجود ہو تو (سمجھو کہ) وہ کسی غیر کے وہم و گمان اور خیال سے بھی ناواقف ہے۔

اور جب خارجی طور پہ معانی (اور مطالب کو دل سے) نکال دے تو پورا ظہور ان معانی میں پیدا ہو جاتا ہے اور ایسی اچانک (پیدا شدہ) صورتِ حال میں ان معانی کا اخراج و نکالنا اور عدمِ اخراج (نہیں نکالنا) (یہ دونوں بآسانی) جان سکتے ہیں اور ان کے اخراج کا احساس اور غیر احساس ہوتا رہتا ہے۔

اعیان کا غیب علمی

یہاں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انسان کو غیب علمی میں کچھ مراتب بھی ہیں چنانچہ انھیں وجود عینی میں مرتبے اور مقام ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ثبوتِ علمی اور وجودِ عینی میں خارجی طور پہ فرق عدمِ ظہور کا ہوتا ہے جیسا کہ (علامہ) قیصریؒ کی کتاب "فصِ یوسفی" میں موجود ہے۔

اشیاء وجودی کی حد بندی، درجہ بندی اور مراتب

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اشیاء وجودی اگر کسی درجہ میں ہوں تو خیال و حس کی قوتِ جسمانیہ کی رسائی ان تک نہیں ہوتی۔ یعنے ان کا ادراک اور پہچان نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی پہچان عقل کرتی ہے اور یہ عقل آثار و علامات کے ذریعہ پہچاننے میں آتی ہے۔ جیسا کہ قوائے سبعۂ جسمانیہ یعنے بدن کی سات قوتیں ہیں:
۱۔ خاذیہ (لینے اور پکڑنے والی طاقت)۔ ۲۔ جاذبہ (کھینچنے والی طاقت)۔ ۳۔ ہاضمہ (ہضم کرنے والی طاقت)۔ ۴۔ ماسکہ (روکنے والی طاقت۔) ۵۔ دافعہ (ہٹانے والی اور رد کرنے والی طاقت) ۶۔ نامیہ (بڑھنے بڑھانے والی طاقت۔) ۷۔ مولدہ (پیدا کرنے والی قوت ہے۔) جو جسم میں پیوست اور ملی ہوی ہے۔ ان قوتوں کا دوسرا نام بھی ہے جنھیں حضرتِ ارواحِ نوری، ملائکِ عقول اور نفوس بھی کہتے ہیں۔

اور اگر (یہ وجودی اشیاء) کسی مرتبہ پہ پہنچیں کہ ان کی پہچان خیالِ مطلق ہو تو انھیں حضرتِ مثالِ مطلق اور برزخِ جامع بین الطرفین بھی کہتے ہیں۔ اور اگر (یہ وجودی اشیاء) کسی حد پہ پہنچ جائیں کہ ان کی پہچان خیالِ مقید حیوانی کے ذریعہ ہو تو ان کو حضرتِ مثالِ مقید کہتے ہیں۔ اور اگر یہ ایسی حد تک پہنچ جائیں، جن کی پہچان حس کے ذریعہ ہوتی ہو تو انھیں حضرتِ حسّ و شہادت اور عالمِ اجسام بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت جامیؒ کی کتاب "نقد النصوص" میں مذکور ہے۔

عالمِ اجسام کے تابعین

عالمِ اجسام کے تابع دوسرے بہت سے عالم بھی ہیں، جیسے حرکت ہے، سکون ہے، بوجھ (وزنی ہونا) اور ہلکاپن، لطافت و کثافت (نرمی

اور باریکی، موٹاپا اور سختی) مختلف رنگین اور روشنیاں، آوازیں، اور خوش بُو اور بدبو اور قسمیں اور ان کی انواع واقسام اوران انواع واقسام میں سے ہر قسم بھی ایک (مستقل) عالم ہے۔ اور اسی طرح عالمِ ارواح کے تابع دوسرے بہت سے عالم ہیں۔

انجامِ عالم

نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تمام اقسامِ عالم کا انجام اور نتیجہ عالمِ انسان ہے۔ جس طرح درخت کا نتیجہ اور انجام پھل ہوتا ہے۔ اسی طرح (تمام) موجودات کی ایجاد سے مقصود (اور نتیجہ) انسانِ کامل اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ اور اہلِ دل ہیں۔

غرض (ایک) پودے کے اُگانے کا مقصد پختہ اور مکمل پھل حاصل کرنا ہے۔ (اور ساری کائنات کی ایجاد کا) آخری مقصد اور نتیجہ خاتم الانبیاء سرورِ اصفیاء (محمد رسول اللہ) علیہ وعلیہم من الصلوات افضلہا ومن التحیات اکملہا (آپ پر بھی اور تمام نبیوں پر بھی افضل ترین درود وسلام اور اکمل ترین دعا وبرکات ہوں) کی ولادتِ باسعادت ہے۔

(بہر حال) جب درخت کے لگانے کا انجام کار اور نتیجہ مکمل اور بہترین پھلوں کا حصول و مقصد ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان بھی ان ہی مظاہرِ مجرّدہ اور مادّوں (جوہروں اور اصلیت) میں ہے۔ اور اس ذات کی شہادت وگواہی (خود یہی ذرّات اور مادّے دیتے ہیں کہ بغیر کسی ذات کی ایجاد کے یہ آپ خود سے نہیں اُگتے اور وجود میں نہیں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے کوئی ذات ہے جو اُگاتی ہے، جلاتی ہے اور لہلہاتی ہے۔)

کائنات میں پائی جانے والی تمام موجودات میں خاص اللہ کی ذات کی شہادت کے لیے مکمل نامیں نہیں ہیں۔ اگر کن کن کے نام گنوائے جائیں؟ اور کہاں تک گنوا سکیں۔ یہ مشکل ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنیِ مطلق ہے۔ ہر چیز سے بے نیاز ومستغنی ہے۔ ذات میں بھی، صفات میں بھی اور افعال میں بھی۔ کسی بھی کام میں کسی بھی چیز میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے جس طرح وہ وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہے اسی طرح ظہور میں بھی اسے احتیاج نہیں ہے۔

شہودِ عیانی

بہر حال یہ شہودِ عیانی (آنکھوں سے دیکھنا) ایک وجود ہے۔ جب مختصر شہود مفصّل میں، واحد، کثرت میں (ایک زیادہ میں) کھجور کی گٹھلی کھجور میں ہے تو اسی مُتابعت سے اللہ کی ذات اور اس کی مخلوقات کی پہچان ومعرفت ہوتی ہے۔

غرض خدا کی معرفت تو بہت دُور کی بات ہے۔ اکثر حضرات اپنی رُوح اور مثال کو بھی نہیں پہچان سکتے اور جسم کے مرتبے کے پسِ پُشت اور پیچھے بھی ایک دوسرا مرتبہ ہے۔ خود اسے بھی نہیں جانتے اور نہیں سمجھ سکتے اور جب خود اپنی جان اور مثال کی معرفت میں (انسان حیران وپریشان اور سرگرداں ہے۔) اور اسے اس قدر دشواری اور سراسیمگی ہے تو بھلا قیاس کرو کہ معرفتِ جانِ جان اور خالقِ جان کس قدر مشکل اور دشوار ہوگی! ؏

قیاس کُن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ (خود اپنے باغ سے اپنی بہار کے متعلق سوچ اور غور کر۔)

دھرم اپنا اپنا خیال اپنا اپنا

(اسی عدمِ معرفت کی بنا پر) کافروں (یہودیوں) نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو (خدا کے درجے تک پہنچایا) اور بعض (نصاریٰ) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (خدا کا بیٹا بنا دیا) اور بعضوں نے چاند اور سورج کو (پُوجنا شروع کر دیا) اور بعضوں نے آگ کو (اپنا معبود بنالیا) اور بعضوں نے (اپنا خدا) رام و کشن، گائے اور بیل، بندر، درخت نیم، درخت پیپل کی شاخیں (دُم)، نیز سونا، چاندی، پتھر کی تراشی ہوئی مُورتیاں اور بے تراشے پتھر اور دریائے گنگا، دریائے جمنا وغیرہم) کو (تصرف والے) مالک اور نفع و نقصان پہنچانے والے (خدایان) مان لیا۔

اور یہ سب ان کی محض بیوقوفی ہے کہ ایک درخت کو بھی (اپنے عقیدے کے مطابق) دُرست مانتے ہیں اور ایک پتھر کو بھی۔ بلکہ اینٹ کے ایک ٹکڑے کو اور گوبر اور قضیب (مرد کی شرمگاہ) کی شکل اور عورت کی شرم گاہ کی شکل بنا کر بھی پوجتے ہیں۔

نیز سانپوں کی جتنی قسمیں ہیں، ان کے متعلق بھی نفع و نقصان کی امیدیں رکھتے ہیں۔ (یعنی انھیں نافع اور ضار کے مختارِ کل سمجھتے ہیں۔) جب سانپ کے زہر سے کسی انسان کی جان عزیز (خطرے میں ہو) اور تلف ہونے کا اندیشہ ہو تو اس موذی سانپ کو سلام در سلام کرتے ہیں اور کسی مرض و بیماری کے دُور کرنے کے لیے گائے کا پیشاب سریع الاثر اور تریاق) سمجھتے ہیں اور (اس پیشاب کو بابرکت سمجھ کر) اپنے سروں پر نہ صرف ڈالتے اور چھڑکتے ہیں بلکہ (تبرک سمجھ کر) پیتے بھی ہیں۔ مگر ان تمام بے ہُودہ اور گندے خیالات کے باوجود اپنے بھائی (کے) منہ کے لُعاب اور جھوٹے سے انھیں شدید نفرت و اجتناب ہے۔ (فیا للعجب! اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔)

جب ایک بے جان و بے حس صورت کی پرستش ہوتی ہے تو اس پر ایک بڑا قافلہ ماتم کردوں کا رواں دواں ہے یہ دنیا دار لوگ چین و سکون پہ خوب حرص کرتے ہیں جس طرح سعدیؒ اس سنگ دل بت سے وفا کرتا ہے۔ یہ زبان والے (انسان) ہر مقام و مکان سے (عقل و خرد سے ہوش و حواس سے) آگے نکل گئے اور ان بے زبانوں (نباتات و جمادات) کے آگے الحاج و زاری، آہ و فریادی بن گئے۔ (ان کی اس بے عقلی، کم فہمی اور بیوقوفی کے اس عجیب و غریب) ماجرے کو دیکھتے ہوئے (مارے شرم کے زمین میں) دھنسا جاتا ہوں کہ ایک زندہ (اشرف المخلوقات انسان آخر) جمادات کی پوجا پاٹ کیوں کر رہا ہے۔؟ اور ایسے بے ہوش و حواس بدمست و بے زبان کمزور و ناتوان حجر و شجر ہی ان کے سب کچھ ہیں تو سمجھو کہ ان خداؤں نے تمہیں گمراہی اور بے راہ روی کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا (اور قعرِ مذلت میں ڈال دیا)۔

بھلا خود ہی سوچو کہ (ان خودساختہ مورتیوں کے) نہ تو ہاتھوں میں کوئی طاقت ہے اور نہ پاؤں میں حرکت: بقول شاعر:

شعر

نہ ہاتھوں میں جُنبش نہ پاؤں میں طاقت — کہ اُٹھ کھینچیں دامن ہم اس دل رُبا کا

بُرا ہوگا انجام ان مورتیوں کا — نہیں ہوگا ہمدرد بے دست و پا کا

اور اگر انھیں کچھ ہلائیں، حرکت دیں تو یہ اپنی جگہ سے ہٹ بھی نہیں سکتے۔ سُبحانہٗ وتعالیٰ عمّا یقولُ الکافِرون۔
(پاک ہے وہ ذاتِ باری تعالیٰ ان باتوں سے جو یہ کافر لوگ گھڑتے ہیں۔)

تشریحِ مترجم

ان من گھڑت بے ہودہ اور فرسودہ خیالات کی تردید میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ (سورۃ حج: رکوع ۱۰)

یعنی اے لوگو! ایک مثل کہی ہے سو اس پر کان رکھو۔ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے ہرگز نہ بنا سکیں گے (وہ) ایک مکھی۔ اگرچہ (یہ) سارے جمع ہوجائیں اور اگر کچھ چھین لے اُن سے مکھی چھڑا سکتے نہیں وہ اُس سے۔ بودا ہے چاہنے والا بھی اور جن کو چاہتا ہے (وہ بھی بودا ہے)۔

مکھی تمام جانوروں میں بہت ہی ادنیٰ اور حقیر جانور ہے۔ پھر جن چیزوں میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ سب مل کر ایک مکھی پیدا کریں یا خود مکھی ان کے نذرونیاز میں سے کوئی چیز لے اُڑے تو پھر اس سے واپس لے سکیں۔ ان کمزور اور بے حقیقت اشیاء کو خدائے کائنات کی ذات کے ساتھ جُڑ دینا یا خدائی اور معبودیت کی کرسی پر بٹھا دینا کس قدر حماقت، بے حیائی اور شرمناک گمراہی اور گستاخی ہے۔

یہ حقیقت ہے اور اظہر من الشمس ہے۔ ایک معمولی مکھی تو خیر کم زور ہے ہی، مگر اس مکھی سے زیادہ اور بدتر ان کے یہ خود ساختہ بُت کمزور ہیں اور ان بتوں سے بڑھ کر ان کا پُوجنے والا کم زور و حقیر ہے۔ جس نے جان بوجھ کر ایسی حقیر ادنیٰ اور کم زور چیز کو اپنا معبود اور خدائے حاجت روا بنا لیا۔ العیاذ باللہ۔

ان آیتوں سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ مُشرک خواہ کتنا ہی زور دکھلائے اس کا دل کم زور ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کم زور، بے جان اور بے حس مخلوق کی عبادت کرتا ہے۔ پھر تو جیسا معبود ہے ویسے عابد ہوئے، ضعف الطالب والمطلوب کا آخر یہی تو مطلب ہے۔

غرض اصلی زور و طاقت یہ در حقیقت تائیدِ خداوندی اور امدادِ الٰہی سے ہے۔ جس سے کُفّار و مُشرکین یقیناً محروم ہیں۔ اس لیے جب تک مُسلمان، مُسلمان رہے، ہمیشہ کفّار اُن سے خائف و مرعوب تھے اور ڈرتے رہتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عالمِ اسلام میں باوجود مسلمانوں کے سخت انتشار و تشتت اور ضعف و تنزل کے دنیا کی تمام کافر حکومتیں اور شیطانی طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر پوری دنیا کا مانا ہوا یا منوایا ہوا سُوپر پاور طاقت ور امریکہ اپنے حریف مقابل صدام حسین سے ہمیشہ خائف ہے ڈرتا ہے اور آج بھی اگر اسے دنیا کی کسی طاقت سے ڈر ہے تو وہ صرف اور صرف صدام کی حرارتِ ایمانی اور جذبۂ

بیداری سے ہے" صدام" شیر کی آواز (جیسے ایک) امریکہ کی نیند اور چین حرام کر دیتی ہے۔ اس لیے انھیں ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ یہ مسلم قوم کسی حال بیدار نہ ہونے پائے۔ حالاں کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ "یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" بھی ایک حقیقت ہے۔ (تشریح ختم)

مُلحدین کی خُدائی

اور بعض مُلحد (محض) عشق (مجازی) کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ اور بعض اپنی عقل کو اور بعض روح کو اور بعض نے جسم کو اور بعضوں نے عناصر (اربعہ) کو اور بعضوں نے اپنی خواہشات کی پرستش کو روا رکھا اور بعض نے اس نور کو جو آنکھوں کے مَلنے اور رگڑنے سے آنکھوں میں پیدا ہوتا ہے (اسے خدا مان لیا۔) اور بعضوں نے کسی بلند و بالا (ارفع و اعلیٰ) سایہ کو خدا کہا اور بعضوں نے (اس کے اندر اور ترقی کی) اور تمام مخلوقات اور (اشیاء) کو خدائی کا مرتبہ عطا کر دیا۔ اور انھوں نے یہ خدا کی مخلوق کو خدا ماننے کی دلیل یہ دی ہے کہ جب گائے کو مار کر اس کی بوٹی بوٹی اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں۔ پھر گائے کی تلاش و جستجو کریں گے تو ان ہی ٹکڑوں کے اندر گائے کو پائیں گے۔ اگرچہ کہ گائے خارجی طور پر (اپنی اصلی شکل و صورت میں) الگ سے موجود نہیں ہے۔ (مگر ان ٹکڑوں میں تو ضرور ہے۔) اسی طرح سمجھو کہ اگر کوئی خدا کو تلاش کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ ان ہی مخلوقات میں ڈھونڈھے۔ کیوں کہ خدا تو (دراصل) یہی مخلوق ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک الکلمات والھفوات۔ یہ ان عقل کے دشمنوں کی دلیل ہے۔

جاہلوں کا شرکِ خفی، بدعات و خرافات

ان جاہلوں نے سونے، چاندی، تانبا اور لوہے سے بنائے ہوئے پنجوں سے مرادیں مانگنا شروع کر دیا۔ نیز جھنڈوں اور چھوٹی قبروں یعنے فرضی قبروں، تابوتوں، تصویروں اور نشانوں، ستونوں اور ان کے حلقوں اور دیواروں سے بھی مرادیں مانگنے کا دستور بنا لیا۔ پھر سلاموں پہ سلام، سجدوں پر سجدے کرنے لگے۔ (پھر مزید برآں طُرفہ تماشہ یہ کہ) ان بے ہوش و گوش اور بے حس و حرکت چیزوں سے مرادیں مانگنے پر آپ خود سے خوش بھی ہیں۔ (اور مطمئن بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ حضرات) اپنے مال و دولت کو بھی اور اپنی عمر عزیز کو بھی برباد و ضائع کر رہے ہیں۔ یہ ایسے نرے بے وقوف ہیں کہ (ابرک (جیسی ہلکی پھلکی نہایت پتلی دھات) پر حماقت کا نہایت وزنی بوجھ لا د رہے ہیں۔ جب اصل حقیقت کو چھپا دیا گیا۔ (راستوں کے خطرات اور نشیب و فراز پر پردہ ڈال دیا گیا۔) تو اب جس طرف کو چاہو نکل جاؤ۔ (آگے قعرِ مذلّت میں پڑ کر؛ ۔ ۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے
گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

کا سامنا ہے۔) سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى عَمَّا يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (پاک ہے وہ ذات سبحانہ وتعالیٰ ان باتوں سے جو ان ظالموں نے گھڑ لیا ہے۔

(یاد رکھو! حضرت عیسیٰ و عُزیر علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام بھی نیز رام، سانپ (بقیہ صفحہ 144 پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انشائے عقائدِ ذوقی

تصنیف

قدوۃ السالکین حضرت مولانا غلام محی الدین شاہ سید عبد اللطیف قادری ذوقی ویلوری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مولوی سید حمید اشرف کچھوچھوی علیہ الرحمہ سابق استاذ دار العلوم لطیفیہ ویلور

تقدیم و ترتیب

مولوی حافظ ابو النعمان بشیر الحق ایم، اے؛ استاذ دار العلوم لطیفیہ ۔ ویلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آئندہ صفحات میں خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب اور کرامات سے متعلق حیرت انگیز اور نادرونایاب واقعات آرہے ہیں جن سے عوام ہی نہیں خواص بھی شاید ہی واقف ہوں۔ یہ سارے واقعات حضرت ذوقی علیہ الرحمہ کی فارسی قلمی تصنیف "انشائے عقائدِ ذوقی" میں درج ہیں۔ جو واقعات اور مکتوبات کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور یہ مخطوطہ خود مصنف علیہ الرحمہ کے دستِ مبارک سے نقل شدہ ہے۔ راقم الحروف کو اس کے جاری تحقیقی سفر میں ایک رقعہ کا ترجمہ ہاتھ لگا جو تقریباً ربع صدی قبل استاذ محترم مولانا مولوی سید حمید اشرف کچھوچھوی کے قلم سے صادر ہوا ہے۔ اسی کو نظرِ ثانی کے بعد تبرکاً و تیمناً پیش کیا جارہا ہے۔

اس مقام پر حضرات صحابہ سے متعلق چند تقدیمی کلمات اور تمہیدی فقرات سپرد قلم کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے کیوں کہ تجدد پسند طبقہ صحابۂ کرام اور اکابر امت کے فضائل و مناقب اور خرقِ عادت اور کرامات جیسے موضوعات کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتا۔ حالاں کہ یہ چیزیں بھی صحابۂ کرام کی سیرت و سوانح کا ایک مفید حصہ ہے۔ جس میں تقویتِ ایمان اور صلاح و فلاح کا سامان موجود ہے اور صحابہ کے بعض فضائل ایسے ہیں جو صرف انھیں کے ساتھ خاص ہیں اور دین میں ان حضرات کا جو مخصوص مقام اور متعین مرتبہ ہے وہ اب کسی طائفہ کو نہ مل سکتا ہے اور نہ ہی دیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابراھیم بن جوہری کا قول ہے: لا نعدل باصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم احداً: ہم کسی بھی شخص کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام کا ہم پلہ اور ہم مرتبہ نہیں سمجھتے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک نے ایک سائل کے اس سوال کے جواب میں فرمایا: ابھما افضل معاویہ ام عمر بن عبد العزیز؟ الغبار الذی دخل انف فرس معاویہ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر من عمر بن عبد العزیز۔ حضرت معاویہ رض افضل ہیں یا عمر بن عبد العزیز؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پہنچا ہے وہ بھی حضرت عمر بن عبد العزیز سے بہتر ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کے اسم مبارک کی صراحت ہی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرات تابعین جو سابقینِ امت میں سے ہیں، انھیں بھی صحابۂ کرام کے ہم مرتبہ قرار نہیں دیا جاسکتا، تو عام افرادِ امت کیوں کر صحابۂ کرام کے ہم مقام اور ہم سر ہو سکتے ہیں؟ حضرات صحابہ کی تقدیس و تکریم اور تفضیل کے لیے وحیِ محمدیؐ کا یہ مختصر ترین فقرہ رضی اللہ عنھم ہی کافی ہے۔ جس میں اس طائفہ کے ساتھ ربِ کریم کی رضا و خوشنودی کی سند موجود ہے لہذا یہ وہ فضیلت ہے اب کسی فرد اور جماعت کو حاصل ہو نہیں سکتی اور ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ انبیائے کرام ساری مخلوق میں افضل ہیں اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء میں افضل

ہیں اور ساری امت میں صحابہ کرام افضل ہیں اور سارے صحابہ میں خلفائے اربعہ افضل ہیں اور ان میں سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں پھر حضرت عمر پھر حضرت عثمان، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ حضرت علی کے بعد باقی عشرۂ مبشرہ (حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح) افضل ہیں۔ عشرۂ مبشرہ کے بعد اہلِ بدر اور ان کے بعد اہلِ احد اور ان کے بعد اہلِ بیعت رضوان افضل ہیں۔ ان کے بعد تمام صحابۂ کرام افضل ہیں۔ اور سارے صحابہ کا ذکر صرف خیر و بھلائی اور عزت و عظمت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اور ان کے درمیان پیش آنے والی لڑائیوں، اور دشمنیوں) اور ناخوش گوار باتوں کی جانب التفات نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی باتوں کو موضوعِ بحث بنانے سے صحابۂ کرام کے ساتھ بغض پیدا ہوگا اور صحابہ کے ساتھ بغض ایمان کو سلب کر دیتا ہے۔ بھلا کون ایسا مسلمان ہے جو ایسی غیر مفید اور موجب فتنہ باتوں کی طرف التفات کرتے ہوئے اپنے دین و ایمان کو ضائع کردے۔

اہلِ سنّت وجماعت کا یہ متفق اور مسلّم عقیدہ ہے کہ جس طرح انبیائے کرام سے خلاف عادت امور کا صدور ہوا اسی طرح صحابہ کرام اور اولیائے کرام سے بھی خلافِ عادت امور کا ظہور ہوتا ہے۔ اس قسم کی چیز اگر صحابۂ کرام اور اولیائے کرام سے صادر ہو جائے تو "کرامت" کہیں گے۔ اور انبیائے کرام سے اعلانِ نبوت سے پہلے صادر ہوجائے تو "ارہاص" کہیں گے اور اعلان نبوت کے بعد صادر ہو جائے تو "معجزہ" کہیں گے۔ اور عامۃ المؤمنین سے صادر ہو جائے تو "معونت" کہیں گے اگر کسی کافر شخص سے صادر ہو جائے تو "استدراج" کہیں گے۔ معجزہ ہو یا کرامت یہ دونوں اللہ تعالیٰ کا فعل اور اسی کا تصرّف ہے۔ انبیائے کرام اور اولیائے کرام اس کے مظہر ہوتے ہیں اور اسی طرح انبیائے کرام صحابہ کرام اور اولیائے کرام کو غیبی حقائق اور مخفی امور سے علم و آگہی بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیائے کرام کو وحی اور الہام کے ذریعہ کو مطلع کیا جاتا ہے تو صحابۂ کرام اور اولیائے کرام کو الہام کے ذریعہ مطلع کیا جاتا ہے۔ وحی کے ذریعہ جن علوم و معارف اور غیبی امور و حقائق کی نشان دہی کی جاتی ہے وہ چیزیں یقینی اور قطعی ہوا کرتی ہیں۔ اسی لیے سرورِ انام صلے اللہ علیہ وسلم کا الہام حجت قطعی ہے۔ اور صحابہ و اولیاء کرام کا الہام غیر قطعی اور اختلافی ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا الہام آپ کی ذاتِ اقدس کے لیے بھی اور امّت کے لیے بھی حجتِ قطعی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں یعنی صحابہ و اولیاء کرام کے الہام سے متعلق عامۃ المسلمین کا قول ہے کہ صرف صاحبِ الہام پر حجت ہے۔

یہاں کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ تکمیلِ وحی کے بعد الہام کی کیا ضرورت ہے اور وہ کونسی کمی رہ گئی تھی جو الہام کے ذریعہ پوری کی جارہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ الہام دین کے کمالاتِ خفیہ کو ظاہر کرنے والا ہے نا کہ دین میں زائد کمالات کو ثابت کرنے والا جس طرح اجتہاد، مظہرِ احکام ہے اسی طرح الہام، مظہرِ اسرار ہے۔ اجتہاد اور الہام میں یہ فرق ہے کہ اجتہاد کا اعتماد

عقل و درایت اور رائے پر ہے اور الہام کا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس اعتبار سے الہام میں ایک قسم کی اصلیت پیدا ہو جاتی ہے، جو اجتہاد میں نہیں ہے۔

الہام کی اس علمی و دینی اور شرعی حیثیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ بھی جان لینا چاہیے کہ الہام و کرامت سے متعلق رکھنے والی ایک حقیقت ہے اور یہ چیز صحابہ کرام کی زندگیوں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام کو یہ الہام شخصی اور انفرادی حیثیت سے ہوا ہے تو کبھی اجتماعی اور جماعتی حیثیت سے بھی ہوا ہے۔ اسی الہامی کیفیت کو امام مالکؒ نے علم نورانی سے تعبیر کیا ہے۔ جو منجانب اللہ صالح بندے کے قلب میں القاء کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے صاحبِ الہام پر کائنات کے اسرارِ سربستہ اور حقائق کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ لیس العلم بکثرۃ الروایۃ انما العلم نور یقذف فی القلب یعنی قیل و قال، بحث و مباحثہ، اخذ و نقل اور کثرتِ روایت کا نام علم نہیں ہے۔ بلکہ علم تو ایک نور ہے جو آدمی کے قلب میں پہنچ جاتا ہے۔

ملا حسن کا یہ قول بھی اس حقیقت کو مزید نمایاں اور آشکار کر دیتا ہے العلم نور یتجلی بہ الامر الواقعی علم تو ایک نور ہے جس کے ذریعہ حقائق و معارف اور آیندہ کے واقعات سے علم و آگہی اور معرفت حاصل ہوتی ہے۔

الہام کی ایک صورت خواب ہے، جو اللہ نے تکمیلِ وحی کے بعد مبشّرات (سچّے خواب) کی شکل میں باقی رکھا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرویا الصالحۃ : حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

نبوت کے آثار و علامات میں سے اب مبشرات کے سوا کچھ باقی نہیں ہے۔ یہ سُن کر صحابہ کرام نے پوچھا: یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ ارشاد فرمایا سچّے خواب۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا: نیک خواب جن کو ایک مسلمان اپنے لیے دیکھے یا اس کے لیے کوئی اور شخص دیکھے۔

مصنفِ "منصبِ امامت" رقمطراز ہیں: از جملہ اقسامِ الہام خواب است کسے را از مقبولین عالی مقام در حالت نام برامرے از امورِ غیبیہ مطلع فرمانید۔ الہام کی صورتوں میں سے ایک صورت خواب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کو اسرارِ سربستہ اور امورِ غیبیہ سے مطلع فرماتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ہے۔ جس کو امامِ غزالی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "احیاء" میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اپنی وفات سے قبل اپنی صاحب زادی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میرے وارث تمہارے علاوہ تمہارے دو بھائی اور دو بہن ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے اس فرمان کے وقت حضرت عائشہؓ کی ایک ہی بہن حضرت اسماء تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حضرت ابو بکرؓ کی اہلیۂ محترمہ حمل سے تھیں۔ بعد میں ان سے لڑکی تولد ہوئی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو الہام کے ذریعہ ان کو لڑکی تولد ہونے کی خبر مل چکی تھی۔ اسی لیے انھوں نے حضرت عائشہ سے دو بہنوں کا ذکر کیا۔

اسی طرح عہدِ نبوی ﷺ میں اذان اور شبِ قدر کا واقعہ بھی ایک روشن مثال ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہم کو خواب میں اذان کے کلمات کا الہام ہوا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصویب کی اور تصدیق فرمائی اور اعلانِ نماز کے لیے یہی کلمات کہنے کا حکم صادر فرمایا جو آج بھی ساری دنیا میں رائج ہے۔

شبِ قدر کے بارے میں اور بھی چند صحابۂ کرام نے اپنے الہام کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب سات آخری راتوں کے بارے میں یکساں ہیں۔ لہٰذا تم میں سے جو بھی شبِ قدر کو تلاش کرنا چاہتا ہے تو وہ اخیر سات راتوں میں تلاش کرے۔

صحابہ اور اولیاء کے کشف و کرامات کے برحق ہونے کے بارے میں اہلِ سنّت و جماعت کا عقیدہ کتاب و سنّت سے مربوط اور ماخوذ ہے۔ جس میں اختلاف اور انکار کی گنجائش نہیں۔

امام اعظم ابوحنیفۃ النعمان فرماتے ہیں: والآیات للانبیاء والکرامات للاولیاء حق۔ (فقہ اکبر) انبیاء کرام سے معجزات اور اولیائے کرام سے کرامات کا صدور حق اور صحیح ہے۔ شیخ ملا علی قاری فرماتے ہیں: وعند اھل السنۃ والجماعۃ یجوز الکرامۃ: اہلِ سنّت والجماعت اولیائے کرام سے کشف و کرامات کے ظہور کے قائل ہیں۔ اس موضوع کی وضاحت کے لیے درسِ نظامیہ کی معروف کتاب "شرح عقائدِ نسفی" کے اس متن کی تشریح کافی اور شافی ہوگی۔

"وکرامات الاولیاء حق ..... فتظھر الکرامۃ علی طریق نقض العادۃ للولی من قطع المسافۃ البعیدۃ فی المدۃ القلیلۃ کاتیان صاحب سلیمان علیہ السلام وھو آصف بن برخیا علی الاشھر بعرش بلقیس قبل ارتداد الطرف مع بُعد المسافۃ وظھور الطعام والشراب واللباس عند الحاجۃ کما فی حق مریم فانہ کلما دخل علیھا زکریا المحراب وجد عندھا رزقاً قال یامریم انی لک ھذا قالت ھو من عند اللہ والمشی علی الماء کما نقل عن جعفر بن ابی طالب ولقمان السرخسی وغیرھما وکلام الجماد والعجماء۔ واندفاع المتوجہ من البلاد وکفایۃ المھم عن الاعداء وغیر ذالک من الاشیاء وامثال اکثر من ان یحصیٰ۔

اولیائے کرام (صحابۂ کرام نہ صرف طبقۂ اولیاء میں شامل ہیں بلکہ یہ حضرات اولیائے کاملین ہیں۔) کی کرامات حق ہیں۔ خرقِ عادت اور خلافِ عادت کسی ولی سے کوئی بات صادر ہوجائے تو وہ کرامت ہے۔ جیسے سینکڑوں میل کی مسافت منٹوں میں طے کرلینا، چناں چہ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک صحابی آصف بن برخیا نے

ملکِ سبا سے حضرت بلقیس کا تخت پلک جھپکنے سے پہلے حضرت سلیمان کی خدمت میں حاضر کر دیا تھا۔ اور قرآن کریم میں یہ بھی ہے حضرت مریم علیہ السلام کے پاس ضرورت کے وقت کھانے پینے کی چیزیں خلافِ عادت پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے تعجب سے پوچھا تو مریمؑ نے فرمایا: ھو من عند اللہ: یہ چیزیں منجانب اللہ آجاتی ہیں۔

بہت سارے اولیاء کرام سے سمندروں پر خشکی کی طرح چلنا ثابت ہے اور جعفرؓ بن ابی طالب اور حضرت لقمان سرخسی کا غیرہ کا ہوا میں اُڑنا ثابت ہے۔ جمادات اور حیوانات کا انسانوں کی طرح کلام کرنا منقول ہے۔ اور خرق عادت کے طریقہ پر آنے والی بلا اور مصیبت کا ٹل جانا اور غیب سے دشمن دفع ہونا اور ہلاک ہونا وغیرہ اس طرح کے بے شمار واقعات ظہور پذیر ہوے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی ہے کہ آپ نے مدینۂ منورہ میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے مقام نہاوند میں ہونے والی جنگ کا مشاہدہ کیا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ آپ کے بھیجے ہوئے لشکر پر دشمن پہاڑ کی جانب سے حملہ کرنے والا ہے تو آپ نے اسی وقت آواز دی "یا ساریہ الجبل الجبل": "اے ساریہ! پہاڑ کی طرف دھیان دو"۔ آپ کی یہ پکار ساریہ نے میدانِ جنگ میں سُن لی اور اسی وقت اپنی پوزیشن کو سنبھال لیا۔ جس کی وجہ سے دشمن کو حملہ کا موقع نہ مل سکا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے بسم اللہ پڑھتے ہوے زہر کھا لیا تو اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اسی طرح یہ بھی تاریخی واقعہ ہے کہ مصر میں قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ جب بھی دریائے نیل خشک ہو جاتا تو ایک حسین وجمیل دوشیزہ کو بھینٹ چڑھایا جاتا۔ جس کے بعد پانی جاری ہو جاتا تھا۔ مصر مسلمانوں کے زیر اقتدار آنے کے بعد دریائے نیل خشک ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رسم کو پورا کرنے نہیں دیا اور ایک مکتوب دریائے نیل کے نام تحریر کیا اور حکم دیا کہ اس کو دریا میں ڈال دیں۔ چناں چہ مصر کے گورنر نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد دریائے نیل بہنے لگا جو آج تک بھی رواں دواں ہے۔

علامہ تفتازانی نے اس نوع کے مختلف اور متعدد واقعات اور امثال کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ھذا اکثر من تحصی یعنی بزرگوں سے صدور پذیر کرامات اور خرق عادت امور کے ظہور کی مثالیں حدِ شمار سے باہر ہیں۔

غرض صحابہ اور اولیاء سے کشف وکرامات وتصرفات کا ظہور وصدور نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی ہوا ہے۔ چناں چہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت زید بن خارجہ کا واقعہ ہے کہ اُن کے انتقال کے بعد اُن کا جنازہ نماز کے لیے رکھا گیا تھا کہ اچانک لوگوں نے جنازہ سے اُن کی آواز سُنی: السلام علیکم انصتوا انصتوا: لوگو! متوجہ ہو جاؤ اور میری باتیں سنو! اس کے بعد انھوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شہادت دی۔ پھر حضرات شیخین کی صدق وصفائی اور امانت ودیانت کی شہادت دی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ پیش گوئی فرمائی کہ ان کی

خلافت پر چار سال بیت چکے ہیں مزید اور دو سال امن کے ساتھ گزریں گے اس کے بعد فتنوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور بئیر اریس کا حادثہ بھی پیش آئے گا۔

چناں چہ حضرت زید بن خارجہ رضی اللہ عنہ کے کہنے کے مطابق خلافتِ عثمانی چھ سال کی تکمیل کے بعد فتنوں کا شکار ہو گئی اور بئیر اریس کا حادثہ بھی پیش آیا۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں : ذکر البخاری وغیرہ انہ تکلم بعد الموت (الاصابہ) امام بخاری اور دیگر محدثین نے روایت کی ہے کہ زید بن خارجہ نے اپنی وفات کے بعد کلام کیا

حاصلِ کلام ! صحابہ اور اولیاء سے جو بھی الہامات اور کرامات کے واقعات رونما ہوے ہیں۔ خواہ ان کی زندگی میں ہو یا ان کی وفات کے بعد ہر دو حالتوں میں بھی یہ اللہ تعالٰے کا فعل و تصرف اور اسی کی صفت و شان ہے۔ اور یہ حضرات کرام صرف مظہر ہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان واقعات کو دیکھ کر یہ سمجھ لے کہ یہ ان ہی حضرات کا فعل و تصرف اور علم و قدرت کا کرشمہ ہے تو ظاہر ہے کہ یہ فکر آدمی کو گمراہی و ضلالت کی طرف لے جائے گی اور اس کے برعکس اس نوع کے واقعات اور امثال کا مطلق انکار بھی گمراہی و ضلالت ہے جو مقام ولایت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

امید ہے کہ یہ چند سطریں آنے والے واقعات کی صحت و صواب کے بارے میں انشراحِ قلب کا باعث بن جائیں گے۔ وما علینا الا البلاغ ـــ

خلفائے راشدین کے نادر فضائل اور کرامات

تیسواں ۳۰ مکتوب خلفاء راشدین کی کرامات کے بیان میں رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

عزیز سعید احمد شاہ مد عمرہٗ

بعد دعائے درازیٔ حیات و ترقیٔ درجات کے واضح ہو کہ :

★ منقول ہے نقل کیا گیا ہے کہ امیر المومنین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ نے اپنے مرض وفات میں فرمایا آج کی رات امرِ خلافت کے تفویض و تسلیم کے متعلق میں نے بار ہا استخارہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کیا مجھ کو اپنی مرضی پر اطلاع کی توفیق عطا کرے۔ آپ نے فرمایا تم لوگ جانتے ہو کہ میں جھوٹ نہ بولوں گا اور کوئی عقل مند ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت اس پر افتراء و بہتان کو جائز سمجھے گا۔ سب حاضرین نے کہا: اے خلیفۂ رسول اللہ! کسی کو آپ کے صادق القول ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ جو کچھ آپ فرمانا چاہتے ہیں، فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: آخر شب میں جب نیند نے مجھ پہ غلبہ کیا تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ دو سفید لباس میں ملبوس تھے۔ میں ان کپڑوں کے کناروں کو سمیٹتا تھا کہ اچانک وہ دونوں سفید کپڑے سبز رنگ میں تبدیل ہو کر اس طرح چمکنے لگے کہ اس کے نور سے دیکھنے والے کی آنکھ چکا چوند ہوتی تھی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں جانب دو بلند قامت انسان تھے جو بہت حسین و جمیل تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے سلام کر کے مصافحہ سے مشرف فرمایا اور اپنا دستِ مبارک میرے سینے پر رکھا جس سے میری دھڑکن اور اضطراب کو سکون حاصل ہوا۔ آپ نے فرمایا: اے ابو بکر! تمہاری ملاقات کو ہمارا اشتیاق بہت زیادہ ہے۔ اب ہمارے پاس آنے کا وقت ہو گیا ہے یہ سن کر میں خواب میں اس قدر رویا کہ میرے اہل و عیال اس سے آگاہ ہو گئے۔ پھر میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ سے ملاقات کا مجھے کس قدر شوق ہے۔ حضور نے فرمایا: مختصر وقفہ رہ گیا ہے کہ تمہاری ملاقات ہجر و فراق کے اندیشہ کے بغیر ہو گی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلافت کی تفویض میں تمہیں اختیار دیا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ منتخب فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: رعیت کا والی، عادل صادق فاروق کو بناؤ۔ عمر ابن الخطاب زمین و آسمان میں پسندیدہ اور زمانہ میں سب سے پاکیزہ ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ دونوں شخص تمہارے معاون و مددگار ہیں۔ حالتِ حیات اور حالتِ ممات میں اور بہشت میں تمہارے

ہمسایہ ہیں۔ اس کے بعد ان دونوں نے بھی مجھے سلام کیا اور کہا: تم دُنیا کے رنج و غم سے نجات پا گئے، تم آسمان میں، ملائکہ میں، زمین میں اور مخلوق کے درمیان صدیق ہو۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ یہ دونوں شخص کون ہیں کہ ان کا مثل میں نے نہیں دیکھا۔ فرمایا: یہ دونوں بزرگ فرشتے جبرئیل و میکائیل ہیں۔ پھر آپ تشریف لے گئے اور میں بیدار ہوا۔ اس حال میں کہ رخسار آنسوؤں سے تر تھا اور میرے اہلِ بیت میرے سرہانے گریہ کر رہے تھے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: انھوں نے کہا کہ بعض لوگوں نے کہا کہ ابوبکر کو شہیدوں کے درمیان ہم دفن کریں گے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بقیع میں دفن کریں گے، میں نے کہا اپنے حجرہ میں اپنے محبوب کے سامنے دفن کروں گی۔ اسی کشمکش میں ہم تھے کہ خواب مجھ پر غالب ہوا۔ اسی حال میں میں نے سُنا کہ کوئی کہتا ہے دوست کو دوست سے ملا دو۔ جب میں بیدار ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب نے وہی آواز سنی تھی۔ یہاں تک کہ مَردوں نے مسجد میں بھی سنا تھا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے وصیت کیا کہ میرا جنازہ روضۂ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر لے جا کر سلام کر کے عرض کرو: یہ ابوبکر کا جنازہ آپ کے آستانہ پر آیا ہے۔ اگر اجازت عطا ہو اور دروازہ کھُل جائے تو اندر لے جاؤ، ورنہ بقیع میں واپس لے جاؤ۔ راوی کہتا ہے کہ جب ابوبکر کی وصیت کے مطابق ہم نے عمل کیا تو ابھی وہ کلمات ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ پردہ دُور ہو گیا اور آواز ہمارے کان میں پہونچی کہ حبیب کو حبیب کی طرف لاؤ۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے مروی ہے کہ ایک رات آپ کے پاس مہمان پہونچے۔ آپ حضرت رسالت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے۔ سونے کے وقت تک اسی جگہ رہ گئے۔ جب گھر واپس تشریف لائے تو دریافت کیا مہمانوں نے شام کا کھانا کھالیا ہے؟ گھر والوں نے جواب دیا: کھانا ہم لائے، انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اس وقت تک نہ کھائیں گے جب تک آپ بھی ساتھ میں نہ کھائیں۔ حضرت ابوبکر خشمناک ہو گئے اور قسم کھالیا کہ وہ کھانا بالکل نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد فرمایا یہ قسم شیطان کی طرف سے تھی اور اس کھانے سے کھانا شروع کر دیا۔ راوی نے کہا کہ جو لقمہ ہم اس میں سے اٹھاتے تھے تو اٹھانے سے قبل ہی اس کے نیچے دوسرا لقمہ پیدا ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کے سب نے آسودہ ہو کر کھالیا اور جو کچھ باقی رہا وہ پہلے سے تین گنا زیادہ تھا۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کھانے سے کھایا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے مروی ہے کہ مرض الموت کے وقت آپ اپنی اولاد میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ظاہر کرتے تھے۔ حالاں کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ صرف ایک لڑکی آپ کی تھی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا میری تو صرف ایک ہی بہن ہے، دوسری کون ہے؟ آپ نے فرمایا میری خاتون حاملہ ہے۔ مجھے گمان ہے اس کے جو بچّہ پیدا ہوگا وہ لڑکی ہوگی۔ جب ان کی خاتون کو وضع حمل ہوا تو لڑکی پیدا ہوئی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ ایک دن ایک عورت نے خواب میں دیکھا کہ اس کے گھر کے ستون ٹوٹ گئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گئی اور یہ خواب بیان کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا تیرا شوہر مرجائے گا۔

عورت آپ کے پاس سے جانے لگی۔ راستہ میں حضرت صدیق اکبر سے ملاقات ہوئی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا رونے کا کیا سبب ہے۔ عورت نے حقیقتِ حال ظاہر کیا۔ فرمایا تمہارا شوہر صحیح وسلامت آئے گا۔ عنقریب اُس کا شوہر صحت وسلامتی کے ساتھ آگیا۔ عورت یہ دیکھ کر حیران ہوگئی۔ اپنے دل میں کہا کہ علی رضی اللہ عنہ جو کچھ کہتے ہیں حق کہتے ہیں لیکن یہ بات جو آپ کے قول کے خلاف ظاہر ہوئی اس کا سبب کیا ہے! حضرت اس کلام کو سُن کر خاموش رہے۔ اسی درمیان حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! جو کچھ علی نے کہا لوحِ محفوظ میں اُسی طرح مقرر تھا لیکن حضرت صدیق نے آج تک سوا سچ بات کہنے کے کوئی غلط بات زبان سے نہ کہی تھی۔ لہذا اُن کے کلام کو سچ کرنے کے لیے اس شخص کو زندہ کر کے ہم لے آئے۔

★ منقول ہے کہ ایک عورت نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے لڑکے کو پیش کر کے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے امید ہے کہ یہ آپ کی خدمت میں رہے گا۔ حضور نے قبول فرمایا۔ اسی زمانہ میں ایک جنگ واقع ہوئی۔ اور وہ شخص اس جنگ میں مقتول ہوگیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی موجودگی میں دفن کرا دیا۔ جب شہر کی طرف مراجعت فرمایا تو وہ عورت اپنے بچے کے انتظار میں راستہ میں کھڑی تھی۔ جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جمال باکمال پر نظر پڑی تو عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا بات ہے کہ میں سب کو دیکھتی ہوں لیکن میں اپنے بچے کو نہیں دیکھتی کہ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا: علی آتے ہیں ان سے پوچھ لو۔ وہ عورت اپنی جگہ کھڑی رہی۔ علی مرتضےٰ تشریف لائے تو آپ سے بھی سوال کیا۔ فرمایا: عثمان آتے ہیں، ان سے پوچھو۔ امیر المومنین عثمان کے انتظار میں تھی۔ حضرت عثمان تشریف لائے۔ عورت نے آپ سے سوال کیا: فرمایا: عمر آتے ہیں اُن سے دریافت کرو۔ جب حضرت عمر تشریف لائے، عورت نے آپ سے دریافت کیا۔ فرمایا صدیق آتے ہیں اُن سے پوچھو۔ اسی درمیان صدیق اکبرؓ تشریف لائے۔ عورت نے دریافت کیا کہ میرا فرزند کہاں ہے؟ فرمایا: آتا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ابھی اپنی سواری سے نہ اُترے تھے کہ وہ شخص نیزہ ہاتھ میں لیے ہوئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوگیا۔ حضورؐ نے تعجب فرمایا۔ اسی دوران حضرت جبرئیل تشریف لائے اور فرمایا صدیق نے عورت سے کہا کہ تمہارا فرزند آتا ہے۔ آپ کے کلام کو سچ کرنے کے لیے اس مرد کو زندہ کر کے ہم نے بھیج دیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جمعہ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اثنا میں کہ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، خطبہ ترک کر کے دو بار یا تین بار "یا ساریہ الجبل الجبل" کہا اور پھر خطبہ میں مشغول ہوگئے اور خطبہ کو پورا کیا لوگوں کہا شاید عمر دیوانہ ہوگئے ہیں۔ عبدالرحمن ابن عوف رضی اللہ عنہ نماز کے بعد آپ کے پاس آئے اور کہا: اے عمر تمہیں کیا ہوگیا تھا کہ خطبہ کے درمیان تم نے یہ بات کہی اور لوگوں کی زبان کو اپنے اوپر دراز کر دیا۔ آپ نے فرمایا جس وقت میں نے دیکھا کہ ساریہ اور ان کی قوم ایک پہاڑ کے قریب کافروں سے جنگ وجہاد کر رہی ہے اور کفار ان کے آگے اور پیچھے سے حملہ کرتے ہیں۔ جب میں نے اس کیفیت کو دیکھا تو بے قرار ہوگیا اور وہ کلام میری زبان سے صادر ہوگیا۔ یہ اس لیے میں کہا تاکہ لوگ اپنی پیٹھ پہاڑ کی طرف

کروں اور کافروں کے شر وضرر سے محفوظ ہو جائیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ سے ساریہ کے لشکر گاہ تک ایک مہینے کا راستہ تھا۔ جب ایک عرصہ گزر گیا اور ساریہ نے اس سفر سے مراجعت کیا تو بیان کیا کہ جمعہ کے دن کافروں سے ہم جنگ وجدال کر رہے تھے کہ اچانک ہم نے سنا کہ کسی منادی نے آواز دیا کہ "یا ساریہ الجبل الجبل" یہ سن کر ہم نے پشت پہاڑ کی طرف کر دیا اور اس قدر سخت جنگ کیا کہ بہت سے لوگ اُس میں سے قتل ہو گئے اور بہت سے بھاگ گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے والے لوگوں نے یہ کلام سُنا تو کہنے لگے کہ ان کے معاملہ سے درگزر کرو۔ کیوں کہ اُن کا ہر ایک کام حکمت ومصلحت پر مبنی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی لوگوں نے اسی دن اس کلام کو نقل کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوئی کام یا کوئی کلام ایسا نہیں کہتے جس سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ ایک لشکر کو دُور دراز شہر میں آپ نے بھیجا تھا۔ ایک دن آپ نے مدینہ میں آواز بلند کیا: یا لبیکاہ اور کوئی شخص سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا بات ہے۔ یہاں تک کہ وہ لشکر مدینہ سے واپس آیا اور امیر لشکر نے ان فتوحات کو جس کی توفیق خداوند تعالےٰ نے عطا کی تھی شمار کر رہا تھا۔ اس وقت امیر المومنین عمرؓ نے فرمایا: ان باتوں کو چھوڑو۔ اس شخص کا حال بتاؤ جس کو تم نے دریا میں بھیجا تھا۔ امیر لشکر نے کہا: یا امیر المومنین! واللہ ہم نے اس کے ساتھ کسی شر کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ ایک دریا تک ہم پہنچے جس کی گہرائی سے ناواقف تھے اور چاہتے تھے کہ دریا کو پار کریں۔ لہٰذا اس شخص کو ہم نے برہنہ کیا اور دریا میں داخل کر دیا ہوا ٹھنڈی تھی اس میں سرایت کر گئی فریاد کیا واعمرا، واعمرا۔ اس کے بعد جاڑے کی شدت سے ہلاک ہو گیا۔ جب لوگوں نے یہ سُنا تو سمجھ گئے کہ آپ کا لبیک کہنا۔ اس مظلوم کی فریاد کے جواب میں تھا۔ اس کے بعد امیر لشکر سے آپ نے فرمایا کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ میرے بعد دستور بن جائے گا تو البتہ میں تمہاری گردن اڑا دیتا، جاؤ اور اس کی دیت اس کے اہل تک پہنچاؤ اور ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں دوبارہ ایسی حرکت کرتے ہوئے دیکھوں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کو قتل کرنا میرے نزدیک بہت سے لوگوں کی ہلاکت سے بھی بڑھ کر ہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جس وقت ملک مصر فتح ہوا عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ وہاں کے حاکم تھے۔ کسی مہینے میں اہل مصر آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دریائے نیل کی ایک عادت ہے کہ اس کے بغیر وہ جاری نہیں ہوتا اور اس کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ عمرو ابن العاصؓ نے پوچھا وہ عادت کون سی ہے؟ لوگوں نے کہا: وہ عادت یہ ہے کہ جب اس ماہِ رواں سے بارہ دن گزریں گے ہم ایک لڑکی کو حاصل کریں گے اور اس کے والدین کو اس قدر مال ودولت دیں گے کہ وہ راضی ہو جائیں گے، پھر ہم اس کو عمدہ وخوب صورت لباس وزیورات سے آراستہ کریں گے اور دریائے نیل میں اس کو ڈال دیں گے۔ حضرت عمرو نے کہا یہ ایسا واقعہ ہے کہ اسلام میں ہرگز اس کا مثل نہیں ہو گا۔ بے شک اسلام ان تمام بُرے قاعدوں اور رسموں کو جو اس سے پہلے تھیں ویران اور ختم کرتا ہے۔ جب اس تاریخ سے تین ماہ گزر گئے تو دریائے نیل کا پانی بالکل خشک ہو گیا اور اہلِ مصر نے شہر بدر ہونے کا قصد کیا۔ حضرت عمرو نے جب صورت حال کا مشاہدہ کیا تو اس کیفیت کو امیر المومنین

عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لکھا۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کاغذ پر میں نے خط لکھا ہے۔ اس کو دریائے نیل میں ڈال دو۔ جب حضرت عمرؓ کا مکتوب حضرت عمروؓ کے پاس پہونچا تو انھوں نے اس کاغذ کو کھولا اس میں لکھا ہوا تھا۔ "یہ خط اللہ کا بندہ عمر ابن الخطاب امیر المومنین کی طرف سے مصر کے دریائے نیل کے نام ہے۔ بعد حمد و صلوۃ کے مدعا یہ ہے کہ اے نیل اگر تو اپنی مرضی سے جاری ہوتی ہے تو جاری مت ہو، تیرے جاری ہونے کی ضرورت نہیں اور اگر اللہ واحد قہار تمہیں جاری کرتا ہے تو ہم اللہ واحد قہار سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کردے۔" حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے اس کاغذ کو دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دوسرے دن بوقت صبح سولہ گز اونچا پانی دریائے نیل میں جاری تھا اور اس وقت سے ہمیشہ کے لیے یہ عادتِ بد مصریوں سے ختم ہو گئی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جس دن آپ شہید کئے گئے تمام روئے زمین ایسی تاریک ہو گئی کہ بچے اپنی ماں کے پاس آکر کہنے لگے: اے امّی جان! شاید قیامت قائم ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگیں نہیں بلکہ امیر المومنین عمر ابن الخطاب شہید ہو گئے ہیں۔ آپ کی وفات کے دن آپ کے مرثیہ میں شعر سُنے گئے لیکن کہنے والے کو دیکھا نہ گیا۔ یہ بھی منقول ہے کہ جنیّوں نے آپ کے مرثیہ میں اشعار کہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ ایک دن آپ دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آفتاب کی شعاع اس قدر گرم تھی کہ آپ کے سر مبارک میں سوزش ہونے لگی غصّہ میں آگئے اور آفتاب کی جانب غصّہ سے دیکھا اسی وقت آفتاب تاریک ہو گیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ شیخین کی منجملہ کرامات میں سے روافض کا سزایاب ہونا ہے۔ صحابۂ کرام کو سب و شتم کرنے کے سبب سے جیسا کہ امام مستغفری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب "دلائل النبوۃ" میں کسی ایک مستند راوی سے ذکر کیا ہے۔ فرمایا کہ ہم تین شخص یمن کی طرف ہم سفر ہوئے۔ ہمارے ساتھ کوفہ کا بھی ایک شخص تھا۔ جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں کلام ناسزا کہتا تھا۔ ہم جس قدر منع کرتے وہ باز نہ آتا۔ جب یمن کے قریب ہم پہونچے تو وہیں اتر پڑے اور شب باشی کی۔ جب کوچ کرنے کا وقت آیا تو ہم نے وضو کیا اور اس کوفی کو بیدار کیا۔ اس نے کہا، افسوس میں تم سے اس منزل میں جُدا ہو جاؤں گا جب تم نے مجھے بیدار کیا میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ میرے سر کے پاس قیام فرما ہیں اور فرماتے ہیں اے فاسق اللہ تعالےٰ فاسق کو خوار و ذلیل کرتا ہے۔ تو اس مقام میں مسخ ہو جائے گا۔ ہم نے کہا افسوس تیرے حال پر۔ اٹھ اور وضو کر وہ بیٹھا اور اپنے پیروں کو سمیٹ لیا۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ اس کے پیر کی انگلیاں مسخ ہونے لگیں۔ اس کے دونوں پاؤں بندر کے دو پاؤں کی طرح ہو گئے۔ پھر وہ مسخ زانوں تک پہونچا پھر کمر تک اس کے بعد سینے تک اور آخر میں سر اور چہرہ تک پہونچ گیا۔ اور بعینہٖ بندر بن گیا۔ اس کو ہم نے پکڑ کر اونٹ پر باندھا اور روانہ ہو گئے۔ غروبِ آفتاب کے وقت ایسی سرزمین پر ہم پہنچے کہ چند بندر وہاں جمع تھے۔ جب اس نے ان بندروں کو دیکھا تو بہت اضطراب ظاہر کیا۔ رسیوں کو ٹکڑے کر کے انھیں بندروں سے مل گیا۔ اس کے بعد رُخ ہماری طرف کیا۔ دوسرے بندروں نے بھی اس کے ساتھ موافقت کیا۔ وہ ہمارے قریب آکر

اپنی دُم پر بیٹھ گیا ہمارے چہروں کو دیکھتا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے تھے۔ جب تھوڑی دیر ہوگئی تو دوسرے بندر بھی چلے گئے اور وہ بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ نیز امام مستغفریؒ نے علی ابن زید رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے انھوں نے کہا کہ سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے کہا کہ کسی شخص کو بھیجو کہ فلاں شخص کو دیکھے۔ میں نے کہا آپ اس کا حال بتائیے۔ انھوں نے کہا نہیں، کسی کو بھیج کر معلوم کیجیے۔ میں نے ایک شخص کو دریافت حال کے لیے روانہ کیا۔ سعید ابن مسیبؒ نے کہا وہ شخص بعض صحابیٔ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو گالی دیا کرتا تھا۔ اس کے چہرہ پر بال ظاہر ہوئے اور تمام چہرہ کو گھیر لیا اور بالکل سیاہ ہو گیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ نیز امام مستغفریؒ نے ایک شخص سے نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک شخص کوفہ کا باشندہ جو حضرات شیخین کو بُرا بھلا کہتا تھا، ہمارا ہم سفر ہوا۔ ہم نے ہر چند منع کیا لیکن باز نہ آیا۔ ہم نے کہا۔ ہم سے الگ ہو جا۔ مگر وہ جدا نہ ہوا۔ واپسی کے وقت اس کے غلام سے ہم نے کہا کہ اپنے آقا سے واپس ہونے کے لیے کہے۔ غلام نے کہا۔ اس کو عجیب حادثہ پیش آیا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ خنزیر کے دونوں ہاتھوں کی طرح ہو گئے ہیں۔ ہم اس کے پاس گئے، اپنے ساتھ واپس ہونے کے لیے کہا۔ اس نے جواب دیا: مجھے حادثہ عظیم پیش آگیا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو آستین سے نکالا جو خنزیر کے ہاتھوں کی طرح تھے پھر سفر میں ہمارے ساتھ ہو گیا۔ دورانِ سفر میں ہم ایسے مقام پر پہنچے جہاں بہت سے خنزیر تھے۔ اس نے اپنے کو سواری سے نیچے اتار دیا اور خنزیر کی صورت میں تبدیل ہو کر خنازیر سے مل گیا کہ پھر ہم ایک دوسرے سے باہم امتیاز نہ کر سکے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ غازیوں میں سے ایک غازی سے منقول ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک جماعت کے ساتھ غزوہ میں ہم جا رہے تھے ہمارے ساتھ بنو تمیم کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک شخص ابو جبان نام کا تھا۔ جو حضرات شیخین کو گالی دیا کرتا تھا ہر چند ہم منع کرتے مگر وہ باز نہ آتا تھا۔ اس کو ہم ایک حاکم کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا۔ اس کو ہمارے پاس چھوڑ دو اور تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔ ہم اُسے چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ ایک زمانہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ وہ ہمارے پیچھے آتا ہے۔ اس حاکم نے اس کو لباس پہنا کر واپسی کی اجازت دے دیا ہے۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہا: اے خدا کے دشمنو! تم نے کس حال میں دیکھا۔ ہم نے کہا۔ ہمارے ساتھ بے ہودگی نہ کرو۔ وہ راستہ کے ایک جانب چلنے لگا۔ اور ہم دوسری جانب۔ اچانک وہ راستہ سے ہٹ گیا اور قضائے حاجت کے لیے بیٹھ گیا۔ ہم نے دیکھا کہ بھڑوں کی ایک جماعت نے اس پر حملہ کیا۔ اس نے ہم سے مدد طلب کیا۔ ہم نے چاہا کہ اس کو رہا کر دیں۔ لیکن ہمیں پیچھے پلٹنا پڑا۔ بھڑوں نے اس کا گوشت پوست اس طرح نوچ ڈالا کہ ہڈیاں ظاہر ہونے لگیں۔ ہم نے فریاد بلند کی کہ کوئی بنو تمیم سے جو ابو جبان کے ترکہ کو جمع کرے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ اکابر سلف میں سے کسی ایک بزرگ سے منقول ہے انھوں نے کہا کہ میرا ایک ہمسایہ تھا جو شیخین کو بُرا کہتا تھا ایک رات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ابو بکر آپ کے دائیں جانب

اور عمر بائیں جانب تھے ۔میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ! میرا ایک ہمسایہ ہے جو مجھے ان دونوں اشخاص کے بارے میں ایذا پہنچاتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے فرمایا "جاؤ اور اس کے ہمسایہ کو مار ڈالو"۔ جب صبح ہوی تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے جاکر اُسے خبر کر دوں ۔جب اس کے محلہ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے گھر سے نالہ وفریاد کی آواز بلند ہو رہی ہے ۔اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے کہا کل کی رات کسی نے اُس پہ حملہ کر کے قتل کر دیا ۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ اہل بصرہ کے ایک شخص سے منقول ہے ۔انھوں نے کہا کہ ایک بزرگ کے ہاتھ میں نے ایک سامان فروخت کیا ۔پھر معلوم ہوا کہ وہ رافضی ہے ۔جب میری آمدورفت اس کی طرف زیادہ ہوی تو ایک دن شیخین کی نسبت کلام ناسزا کہنا شروع کیا اس لیے اس کے پاس سے مغموم وملول ہو کر اٹھا اور اس رات میں نے افطار نہیں کیا ۔رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو میں نے خواب میں دیکھا ۔میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ! فلاں شخص کو آپ دیکھتے ہیں کہ شیخین کی شان میں کیا کہتا ہے ، فرمایا تم کو بُرا معلوم ہوتا ہے ۔میں نے عرض کیا ہاں ۔ فرمایا ۔جاؤ اُس کو میرے سامنے لاؤ ۔میں جاکر اُس کو لایا ۔اُس کو میرے حوالہ فرمایا اور اور قتل کرنے کا حکم دیا ۔میں نے عرض کیا ۔یا رسول اللہ! کیا اس کو قتل کر ڈالوں ۔ آپ نے پھر قتل کرنے کے لیے فرمایا ۔تین مرتبہ میں نے یہی سوال کیا ۔تیسری بار آپ نے فرمایا : افسوس ہے تیرے حال پر ۔اُسے قتل کر دے ۔ لہذا میں نے قتل کر دیا ۔جب صبح ہوی ۔میں نے کہا کہ اس خبیث کے پاس جاؤں گا اور اس واقعہ کی اس کو خبر دوں گا ۔جب اُس کے محلہ میں پہونچا تو اُس کے گھر سے نالہ و فریاد کی آواز بلند ہو رہی تھی ۔میں نے حقیقتِ حال دریافت کیا ۔لوگوں نے کہا : اُس کو کل کی رات بستر پہ مقتول پایا ہے ۔میں نے کہا واللہ میں نے اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قتل کیا ہے ۔جب اس کے لڑکے کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ تو اپنا مال لے اور ہمیں چھوڑ دے ۔تاکہ اس کو دفن کر دیں ۔میں اپنا مال لے کر روانہ ہو گیا ۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ بعض اسلاف سے منقول ہے ۔انھوں نے کہا کہ بچپن میں میرا ایک معلّم تھا جو مجھے مذہب روافض کی تعلیم دیتا تھا اور میں ابوبکر و عمرؓ کو بُرا بھلا کہتا تھا ۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو گئی ہے اور تمام لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو کھڑے ہیں ۔اچانک میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہیں اور آپ کے بائیں جانب ایک معمّر شخص سیاہ وسفید بالوں والے بیٹھے ہیں اور بائیں جانب بھی اسی طرح دوسرے معمّر شخص ہیں ۔ لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے ہیں ۔میں بھی سلام کرنے کے لیے آپ کے قریب ہوا ۔ان دو شخصوں میں سے ایک نے کہا ۔یا رسول اللہ یہ شخص ہم سے کیا چاہتا ہے ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ مجھ کو پکڑیں ۔خواب سے میں بیدار ہوا ، اسی وقت میرے چہرے اور ابرو کے بال گر گئے اور چار مہینے کی مدّت تک اسی حال میں رہا ۔ ایک دن میرے دوستوں میں سے ایک دوست میرے پاس آیا اور کہنے لگا یہ کیا بیماری ہے کہ تمام اطبا اس کے علاج سے عاجز ہیں ۔میں نے حقیقتِ حال کو اس سے بیان کیا ۔اس نے تعجب سے کہا ۔سبحان اللہ! کیوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حضور تم نے توبہ کیا اور عذر خواہ نہ ہوے ۔اسی وقت طشت اور لوٹا میں نے منگوایا ۔وضو کیا ، دو رکعت نماز ادا کی اور خدا کے حضور میں نے توبہ کیا ۔پھر حضرات شیخین کی فضیلت کا میں قائل ہو گیا

ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرے چہرہ اور ابرو کے بال اُگ آئے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ اکابر سلف میں سے ایک بزرگ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے ملکِ شام کا سفر کیا۔ فجر کی نماز ایک مسجد میں ادا کی۔ جب امام نماز سے فارغ ہوگیا تو حضرات شیخین کے لیے دعائے بد اور بُرا بھلا کہنے لگا۔ جب آئندہ سال دوبارہ میں ملک شام پہونچا تو اتفاقاً فجر کی نماز میں نے اسی مسجد میں ادا کی۔ جب امام نماز سے فارغ ہوا تو حضرات شیخین کے لیے دعائے نیک کیا۔ اہلِ مسجد سے میں نے کہا کہ گذشتہ سال یہ شخص ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے لیے بد دعا کرتا تھا اور اس سال دعائے خیر کیا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ لوگوں نے کہا۔ گذشتہ سال کے امام کو تم دیکھنا چاہتے ہو۔ میں نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھ کو ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا کیا تو وہی امام ہے کہ گزشتہ سال ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے لیے دعائے بد کرتا تھا۔ اس نے اپنے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں میں وہی امام ہوں۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے بعض اسلاف سے منقول ہے انھوں نے کہا کہ میں مدائن میں تھا۔ ہر مردہ کے پاس حاضر ہوتا اور اس کو کفن پہناتا تھا۔ ایک دن ایک شخص یہ خبر لے کر آیا کہ یہاں اہلِ کوفہ سے چند افراد آکر مقیم ہیں۔ ان میں سے ایک کی موت ہوگئی ہے اور کفن نہیں ہے۔ میں نے اپنے غلام کو بھیجا تاکہ اس کے لیے کفن خریدے۔ میں خود اس کے پاس آیا دیکھا کہ وہ مُردہ ہے اور ایک اینٹ اُسکے پیٹ پر رکھی ہے۔ اچانک وہ اٹھ بیٹھا اور کہا "ہائے، افسوس ہائے!" میں نے اس کو کلمہ طیب لاالٰہ الّااللہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے کہا۔ یہ مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ میں ایک قوم کے ساتھ تھا، جو ابوبکر اور عمر کو سب وشتم کرتی تھی، میں بھی اُن کے ساتھ سب وشتم کرتا تھا۔ اب میں ہلاک ہوگیا ہوں اور میری جگہ دوزخ میں مجھے دکھادی گئی ہے۔ اس کے بعد مجھے اٹھا دیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو خوف دلاؤں۔ یہ سن کر میں اس کے پاس سے نکلا اور اس کے ساتھیوں کو اس واقعہ سے خبردار کیا۔ انھوں نے کہا۔ یہ شیطان ہے، جس نے اس کی زبان سے کلام کیا ہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ ایک دن ایک صحابی امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ کے گھر جارہے تھے۔ راستہ میں ایک نامحرم عورت کی طرف نگاہ کیا۔ جب حضرت عثمان کے گھر پہونچے تو حضرت عثمان نے فرمایا: تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے بعض اشخاص ہمارے گھر آتے ہیں اور اس کی آنکھ میں زنا کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس شخص نے کہا: اے خلیفۂ رسولؐ کیا رسول اللہؐ کے بعد بھی وحی نازل ہوتی ہے؟ آپنے فرمایا۔ یہ وحی نہیں ہے، یہ نور فراست ہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ اس رات میں جس کی صبح کو آپ شہید ہوئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپنے فرمایا۔ اے عثمان ہمارے پاس تم افطار کروگے۔ لہٰذا دوسرے دن حضرت عثمان نے اپنے طرف داروں کو اس کا موقعہ نہ دیا کہ وہ مخالفوں سے مقاتلہ کریں۔ اس طرح انھوں نے شہادت کی سعادت حاصل کیا۔

★ منقول ہے بعض مستند راویوں سے منقول ہے انھوں نے کہا میں طواف کعبہ میں مصروف تھا کہ ایک نابینا

کو دیکھا جو طواف کی حالت میں کہہ رہا تھا۔ اے خداوند تو مجھے بخش دے لیکن مجھے یہ گمان نہیں ہے کہ تو مجھے بخشے گا۔ میں نے تعجب سے کہا۔ سبحان اللہ! ایسی جگہ میں تم اس طرح کی بات کرتے ہو۔ اس نے کہا۔ مجھ سے گناہِ عظیم صادر ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ وہ کون سا گناہ ہے۔ اس نے کہا۔ جس دن حضرت عثمان کا محاصرہ لوگوں نے کیا تھا، میں اپنے ساتھیوں میں سے ایک کے ساتھ تھا۔ ہم نے قسم کھائی کہ اگر عثمان مقتول ہوں گے تو ان کے برہنہ چہرہ پر ہم طمانچہ ماریں گے۔ جب ان کو لوگوں نے قتل کیا تو ہم حضرت عثمان کے گھر میں داخل ہوے۔ اُن کا سرِ مبارک اُن کی خاتون کی آغوش میں تھا۔ میرے ساتھی نے ان کی خاتون سے کہا کہ اُن کے چہرہ کو برہنہ کرو۔ خاتون نے کہا۔ تمہارا مقصد کیا ہے؟ میرے ساتھی نے کہا میں نے قسم کھایا ہے کہ اُن کے برہنہ چہرہ پر طمانچہ ماروں گا۔ ان کی خاتون نے کہا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے حق محبت کا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا اپنی دو صاحبزادیوں کا ان کے ساتھ نکاح کرنے کا کچھ بھی لحاظ نہ کرو گے۔ اسی طرح ان کی خاتون نے آپ کے اور بھی فضائل شمار کئے۔ یہ سن کر میرے ساتھی نے شرم کیا اور واپس ہو گیا۔ لیکن میں نے اس بات کی طرف کوئی توجہ نہ کیا اور طمانچہ آپ کے چہرے پر لگا دیا۔ ان کی خاتون نے کہا۔ خداوند تعالےٰ تمہارے گناہ معاف نہ کرے۔ تمہارے ہاتھ کو خشک کرے اور تمہاری آنکھ کو اندھا کرے۔ خدا کی قسم کہ ابھی آپ کے آستانہ سے میں باہر نہ ہوا تھا کہ میرا ہاتھ خشک ہو گیا اور میری آنکھ اندھی ہو گئی اور مجھے گمان ہے کہ اللہ تعالےٰ میرے گناہ بھی نہ بخشے گا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ کو لوگوں نے شہید کیا تو تین روز تک جِنّ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سطحِ مسجد پر نوحہ کرتے رہے اور آپ کے مرثیہ میں اشعار پڑھتے رہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہٗ نے کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہٗ کے قتل کے دن میں نے سنا کہ کوئی کہنے والا کہتا تھا، عثمان ابن عفان کو جنّت کی خوش خبری سنا دو اور ربّ تبارک وتعالیٰ کی جو اُن سے ناراض نہیں ہے۔ ابنِ عفان کو مغفرت اور خدا کی خوشنودی کی خوشخبری سناؤ۔ جب میں نے نظر کیا تو کسی کو نہ دیکھا۔

منقول ہے نقل کیا ہے کہ جب حضرت عثمان غنی کو لوگوں نے شہید کیا تو تین دن تک آپ کو دفن نہیں کیا گیا۔ ناگاہ ہاتفِ غیبی نے آواز دیا کہ حضرت عثمان کو دفن کر دو اور نماز جنازہ نہ پڑھو۔ کیوں کہ اللہ عزوجل نے ان کی نماز جنازہ پڑھ دیا ہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ زمانۂ حج کے کسی موقعہ پر کچھ لوگ مدینہ طیبہ پہونچے۔ ایک شخص بغرض تذلیل و تحقیر امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہٗ کے روضہ پر گیا۔ تمام قافلے والے صحیح سلامت گئے اور بسلامت واپس ہوے۔ ایک درندہ قافلہ کے درمیان آیا اور اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تمام قافلے والوں نے سمجھ لیا کہ یہ واقعہ حضرت عثمان کی بے حرمتی کے سبب سے تھا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہٗ کی کرامات میں سے ایک کرامت یہ ہے کہ آپ کے

دشمنوں میں سے کوئی بھی حافظِ قرآن نہ ہو سکا۔ یہ بات بار بار تجربہ سے دیکھی گئی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہٗ قدمِ مبارک رکاب میں رکھ کر قرآن کی تلاوت شروع فرماتے تو دوسرے قدم کے رکاب میں پہونچنے تک پورا قرآن ختم فرماتے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ چوپایہ کی پشت پر سیدھا کھڑا ہونے تک تمام قرآن ختم فرماتے تھے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما سے ناقل ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ جس رات حضرت علی نے مجھ سے خلوت کیا تو مجھے آپ سے اندیشہ ہوا کیوں کہ میں نے سنا تھا کہ زمین آپ سے کلام کرتی ہے۔ بوقت صبح میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طویل سجدہ کے بعد سر اٹھایا اور کہا۔ اے فاطمہ! تمہاری نسل کی پاکیزگی کی تمہیں بشارت ہو۔ بے شک اللہ تعالے نے تمام مخلوق پر تمہارے شوہر کو فضیلت دی ہے اور زمین کو حکم دیا۔ کہ ان سے اپنے اخبار و احوال بتائے اور مشرق سے مغرب تک تمام روے زمین پر گذریں گے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہٗ کوفہ میں آے اور لوگ آپ کی خلافت پر متفق ہو گئے تو ان لوگوں میں ایک جوان آپ ہی کے گروہ سے تھا جو آپ کے روبرو آپ کے مخالفین سے جنگ کرتا تھا۔ اتفاقاً اُس نے نکاح کر لیا۔ ایک دن حضرت علیؓ نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد ایک شخص سے فرمایا کہ فلاں موضوع میں جائے وہاں ایک مسجد ہے۔ مسجد سے متصل ایک گھر ہے، اس گھر میں عورت اور مرد لڑائی کرتے ہیں، ان کو میرے سامنے حاضر کرو۔ وہ شخص جاکر ان کو لایا۔ آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ آج کی رات تمہارا جھگڑا دراز ہو گیا۔ اس جوان نے کہا۔ اے امیر المومنین اس عورت سے میں نے نکاح کیا۔ جب اس کے سامنے میں آیا۔ مجھ کو اس سے نفرت ہو گئی اگر مجھ سے ہو سکتا تو اس کو اپنے سامنے سے دُور کر دیتا۔ اس نے مجھ سے جنگ و نزاع کرنا شروع کر دیا تا وقتیکہ آپ کا قاصد پہونچا۔ پھر امیر المومنین حضرت علی نے حاضرین مجلس کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔ اور اس جوان اور عورت کو بٹھا کر عورت سے کہا۔ اس جوان کو تو پہچانتی ہے؟ عورت نے لاعلمی ظاہر کی۔ حضرت علی نے فرمایا: میں تجھ سے اس طرح بیان کرتا ہوں کہ تو پہچان لے گی۔ لیکن حقیقتِ حال کا انکار نہ کرنا۔ آپ نے فرمایا کہ تو فلاں عورت ہے، فلاں شخص کی بیٹی ہے۔ اس نے اقرار کیا۔ فرمایا۔ تو نے چچا کے لڑکے کو رکھ لیا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو دوست رکھتے تھے۔ اس نے اقرار کیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تمہارے باپ کی خواہش نہ تھی کہ تمہیں اس کی زوجیت میں دے۔ لہٰذا اس نے پسرِ عم کو اپنے پاس سے الگ کر دیا۔ عورت نے اقرار کیا۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ ایک رات قضائے حاجت کے لیے تو باہر نکلی تو اس نے تجھے پکڑ لیا اور تمہارے ساتھ ہمبستر ہوا۔ تو حاملہ ہوی اور اس کو ماں پر ظاہر کیا اور باپ سے مخفی رکھا۔ جب وضع حمل ہوا رات کا وقت تھا۔ تیری ماں تجھ کو گھر سے باہر لے گئی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو ایک کپڑے میں لپیٹ کر دیواروں کے باہر جو لوگوں کے قضائے حاجت کی جگہ تھی وہاں پھینک دیا۔ ایک کتا آیا

اُس کو سونگھا۔ ایک پتھر تم نے اس کی طرف پھینکا۔ پتھر بچے کے سر پہ لگا اور اس کا سر ٹوٹ گیا۔ تمہاری ماں نے اپنے ازاربند کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کے سر پہ باندھا۔ پھر تم اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔ اور اس کا کوئی حال تم کو معلوم نہ ہوا۔ عورت نے تمام باتوں کا اقرار کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ کہ جب صبح ہوئی تو فلاں قبیلہ نے اس بچہ کو لیا۔ اس کی تربیت و پرورش کی۔ یہاں تک کہ وہ بڑا ہو گیا۔ اور قافلہ والوں کے ساتھ کوفہ آیا اور تجھ کو اپنی زوجیت میں لیا۔ پھر اس جوان سے فرمایا کہ اپنے سر کو کھول۔ اس نے سر کھولا۔ پتھر کا نشان صاف ظاہر تھا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تیرا لڑکا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کو فعلِ حرام سے محفوظ رکھا۔ اپنے لڑکے کو لے اور جا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ اہل کوفہ نے کہا۔ اے امیر المومنین اس سال دریائے فرات میں طغیانی آگئی ہے جس سے تمام کھیتیاں اور فصلیں ضائع ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے دعا کیجیے تاکہ پانی کم ہو آپ فوراً اٹھ کر گھر میں تشریف لائے۔ تمام لوگ باہر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک آپ باہر تشریف لائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا جبہ آپ کے جسمِ مبارک پر حضور کا عمامہ آپ کے سر پر اور حضور کا عصا آپ کے دست مبارک میں تھا۔ پھر آپ نے گھوڑا منگوایا۔ سوار ہوئے۔ تمام لوگ آپ کے ساتھ چلنے لگے۔ جب فرات کے کنارے پہونچے تو سواری سے اُتر کر دو رکعت نماز ادا کی پھر اٹھے اور عصائے مبارک کو ہاتھ میں لیا۔ دریا کے پُل پر چڑھے۔ امیر المومنین حسنؓ اور حسینؓ رضی اللہ عنہما بھی آپ کے ساتھ تھے۔ پھر عصائے مبارک سے پانی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک گز پانی کم ہو گیا، دریافت فرمایا کہ کیا اس قدر کافی ہے۔ لوگوں نے نفی میں جواب دیا۔ دوبارہ پانی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک گز پانی پھر کم ہو گیا۔ اسی طرح تین بار آپ نے اشارہ کیا اور ہر مرتبہ ایک گز پانی گھٹ گیا۔ لوگ شور کرنے اور چلانے لگے کہ بس اسی قدر کافی ہے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حجاج ابنِ یوسف نے کمیل ابن زیاد رضی اللہ عنہٗ کو طلب کیا۔ کمیل اس سے بھاگ کر نکل گئے۔ حجاج نے ان کی قوم کے عطایا اور وظائف کو ضبط کر لیا۔ کمیل نے اپنے دل میں کہا میری عمر ختم کے قریب پہونچ گئی ہے۔ یہ نامناسب ہے کہ اپنی قوم کو بھی محروم کروں۔ حجاج کے سامنے آئے۔ حجاج نے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ تم پر قابو پاؤں۔ کمیل نے کہا۔ میری عمر سے صرف تھوڑی مدت باقی رہ گئی ہے۔ جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کرو۔ اس کے بعد ہماری تمہاری پیشی خدا کے حضور ہوگی اور میرے قتل کے بعد حساب ہوگا۔ مجھ کو امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے خبر دیا ہے کہ میرا قاتل تو ہے۔ حجاج نے ان کی گردن اڑادی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حجاج نے قنبر کو طلب کیا اور پوچھا تم ہی قنبر ہو۔ انھوں نے اقرار کیا۔ حجاج نے کہا۔ علی ابن ابی طالب کے آزاد کردہ غلام ہو، قنبر نے کہا۔ میرا مولا اللہ تعالےٰ ہے اور علی میرے ولی نعمت ہیں۔ حجاج نے کہا۔ علی کے دین سے بیزاری ظاہر کر۔ قنبر نے جواب دیا۔ مجھ کو علی کے دین سے بہتر دین کی طرف رہ نمائی کر۔ حجاج نے کہا۔ تجھ کو قتل کروں گا۔ جس طرح تم قتل ہونا چاہو اختیار کرو۔ قنبر نے جواب دیا۔ تمہیں اختیار ہے جس طرح تم آج مجھے قتل کرو گے میں کل قیامت کے دن اُسی طرح تجھ کو قتل کروں گا۔ مجھ کو امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے خبر دیا ہے کہ تم کو ظلماً قتل کریں گے۔ پھر حجاج نے قنبر کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت براء ابنِ عازب سے منقول ہے انھوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ لوگ میرے فرزند حسین کو قتل کریں گے، تم زندہ ہوگے اور مدد نہ کروگے۔ جب امیر المومنین حسین رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے شہید کیا تو براء ابنِ عازب نے کہا۔ امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے ٹھیک کہا۔ حضرت حسین علیہ السلام شہید کئے گئے اور اُن کی کوئی مدد میں نے نہ کی۔ اس پر نادم اور متاسف ہوئے۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اپنے بعض سفر میں کربلا پہونچے۔ دائیں بائیں نگاہ کیا اور آہ و زاری کرتے ہوئے وہاں سے گزرے۔ پھر فرمایا۔ یہ ہے اُن کے اونٹوں کو سلانے کی جگہ اور اُن کے مرنے کا مقام۔ آپکے رفقاء نے پوچھا۔ اے امیر المومنین یہ کون سا مقام ہے آپنے فرمایا: یہ کربلا ہے۔ اس جگہ ایسی قوم کو لوگ قتل کریں گے، جو بے حساب جنت میں داخل ہوگی۔

★ منقول ہے نقل کیا گیا ہے کہ جب کوفہ سے حضرت علی نے لشکر طلب کیا اور بہت قیل وقال کے بعد لشکر روانہ کیا گیا تو قبل اس کے کہ وہ لشکر آپکے پاس پہونچے آپنے فرمایا کہ کوفہ سے بارہ ہزار کا ایک دوسرا لشکر آرہا ہے۔ آپکے ساتھیوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے حضرت کے اس کلام کو سنا اور لشکر کے گزرگاہ پر بیٹھ گیا۔ ایک ایک کو شمار کرنے لگا۔ خدا کی قسم حضرت نے جو فرمایا تھا۔ اس سے نہ ایک شخص کم تھا نہ زیادہ۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ ایک دن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانۂ اقدس میں تھے اور علی رضی اللہ عنہ آپکے پاس موجود تھے۔ اچانک جبرئیل علیہ السلام آئے۔ غنودگی کی وجہ سے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی ران پر ٹیک لگالیا تھا۔ آفتاب کے غروب ہونے تک سر مبارک حضرت علی کی ران سے نہ اٹھایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نمازِ عصر بیٹھ کر اشارہ سے ادا کی۔ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا: اے علی کیا نمازِ عصر تم سے فوت ہوگئی ہے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! بیٹھ کر اشارہ سے ادا کرلیا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالےٰ آفتاب واپس لوٹا دے۔ تاکہ تم عصر کی نماز وقت پر ادا کرو۔ علی رضی اللہ عنہ نے دعا کیا۔ آفتاب اس مقام پر جو کہ نمازِ عصر کا وقت ہے لوٹ آیا اور علی رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز وقت پر ادا کی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جس وقت آپ بابل کی طرف روانہ ہوئے اور چاہا کہ فرات سے گزریں تو نماز عصر کا وقت تھا۔ اپنے رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ نماز عصر وقت پر ادا کی اور باقی اپنے چوپایوں کو چرانے میں مشغول تھے حتّٰی کہ آفتاب غروب ہوگیا اور نماز عصر ان سے فوت ہوگئی۔ اس بارے میں لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ جب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اس کو سُنا تو اللہ تعالےٰ سے درخواست کیا کہ آفتاب کو واپس لوٹادے تاکہ آپکے اصحاب نماز وقت میں ادا کرسکیں۔ حق تعالےٰ نے آپ کی دُعا قبول فرمایا اور آفتاب نمازِ عصر کی جگہ پر آگیا جب قوم نے سلام کیا تو آفتاب غروب ہوگیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی طرف اس بات کی نسبت کہ وہ ان کی خبریں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاتا ہے۔ اس شخص نے انکار کیا۔ حضرت امیر نے فرمایا کہ کیا قسم کھاتے ہو۔ اس شخص نے قسم کھالی۔ حضرت امیر نے فرمایا۔ اگر اس قسم میں تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تم کو اندھا کرے۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ شخص اندھا ہوگیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفین کے لیے روانگی کے وقت آپ کے رفقا، پانی کے محتاج ہوئے۔ ہر چند وہ دائیں بائیں دوڑے لیکن پانی نہ ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو راستہ سے تھوڑی دور دوسری طرف موڑا۔ ایک بت خانہ ظاہر ہوا۔ اس دیر کے رہنے والے سے پانی کا سوال کیا گیا۔ اس نے کہا کہ یہاں سے پانی تک دو فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اے امیر المومنین اجازت دیجیے تاکہ ہم وہاں جائیں۔ حضرت امیر نے فرمایا۔ اس کی حاجت نہیں ہے۔ اور اپنے خچر کی لگام قبلہ کی طرف پھیر دیا اور ایک جگہ کے کھودنے کا اشارہ کیا۔ جب مٹی کی ایک متعدد بہ مقدار لوگوں نے ہٹایا تو ایک ایسا پتھر ظاہر ہوا کہ اس پر کوئی آلہ اثر نہیں کرتا تھا۔ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ کوشش کر کے اٹھاؤ کیوں کہ یہ پتھر پانی کے اوپر ہے ہر چند سب نے متفق ہو کر کوشش کی مگر اٹھا نہ سکے۔ تب حضرت امیر بذات خود خچر سے اُتر کر آستین کلائی سے اوپر چڑھا کر انگلیاں پتھر کے نیچے داخل کر کے زور کرنے لگے اور پتھر کو پانی کے اوپر سے ہٹا دیا۔ نہایت لطیف، شیریں اور ٹھنڈا پانی کہ کبھی اس سفر میں اس سے بہتر نہ پیا تھا ظاہر ہوا۔ تمام لوگوں نے پانی پیا اور جس قدر چاہا پانی اپنے ساتھ لیا۔ پھر حضرت امیر کرم اللہ وجہہ نے اُس پتھر کو اٹھا کر پانی کے چشمہ پہ رکھ دیا اور فرمایا کہ اس کو مٹی سے پاٹ دیں۔ جب اس گرجا کے راہب نے اس حال کا مشاہدہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا اور دریافت کیا کہ کیا آپ رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ اس نے پوچھا: کیا آپ فرشتۂ مقرب ہیں؟ آپ نے نفی میں جواب دیا۔ پھر اس نے پوچھا آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ پیغمبر مرسل محمد ابن عبد اللہ خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کا وصی ہوں۔ پادری نے کہا۔ ہاتھ لائیے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ حضرت امیر نے اپنا ہاتھ اس طرف بڑھایا۔ اس نے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ تب حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے اس سے ایمان لانے کے سبب کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے کہا ہم نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے اور اپنے علماء سے سُنا ہے کہ اس جگہ پانی کا چشمہ ہے۔ اس کے اوپر پتھر ہے کہ کوئی نہ اس کو جانتا ہے نہ کھود سکتا ہے سوائے پیغمبر یا وصیِ پیغمبر کے۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ نے یہ کام سرانجام دیا تو میں اپنی مراد کو پہونچ گیا اور جس چیز کا انتظار کر رہا تھا اُسے پالیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے ایک دن آپ نے حاضرین مجلس کو قسم دیا کہ جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنا ہو من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ تو وہ اس کی گواہی دے۔ چند انصار حاضر تھے۔ سب نے اس کی گواہی

دیا۔ ایک شخص جس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنا تھا وہ بھی موجود تھا۔ لیکن اس نے گواہی نہ دیا۔ حضرت امیر نے فرمایا۔ اس حدیث کو سننے کے باوجود تم کیوں گواہی نہیں دیتے۔ اس نے کہا میں بڈھا ہو گیا ہوں اور بھول گیا ہوں۔ حضرت امیر نے دعا کیا کہ خداوندا اگر یہ شخص جھوٹ کہتا ہے تو اس کے چہرہ پر برص کا نشان ظاہر کر دے جو عمامہ سے چھپ نہ سکے راوی کہتا ہے کہ واللہ میں نے اس شخص کو دیکھا کہ سفیدی اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ظاہر ہو گئی تھی۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت امیر المومنین حضرت حسن رضی اللہ عنہٗ سے منقول ہے انھوں نے کہا۔ جب امیر کرم اللہ وجہہ نے وفات پائی تو میں نے ایک کہنے والے کو سُنا جو کہتا ہے۔ لوگو باہر جاؤ اور اس خدا کے بندے کو ہمارے پاس چھوڑ دو۔ ہم باہر نکل آئے۔ گھر کے اندر سے آواز آئی کہ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے۔ آپ کے وصی شہید ہو گئے۔ اب امّت کی نگہبانی کون کرے گا۔ دوسرے نے جواب دیا۔ جو شخص ان کی سیرت اختیار کر لے گا اور ان کی پیروی کر لے گا۔ وہی امّت کا نگہبان ہوگا۔ جب آواز بند ہو گئی تو ہم اندر داخل ہوئے۔ آپ کو غسل دیا ہوا اور کفن میں لپیٹا ہوا ہم نے پایا۔ پھر ہم نے آپ پر نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر دیا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ہم کو وصیت کیا تھا کہ جب میں انتقال کر جاؤں تو میری لاش جنازہ رکھو اور سرزمین غرنین کی طرف لے جاؤ۔ وہاں ایک سفید زمین پاؤ گے۔ اُسے کھودنے پر ایک وسیع اور کشادہ زمین ملے گی۔ مجھ کو اسی جگہ دفن کرنا چناں چہ جیسا آپ نے فرمایا تھا، ویسا ہی ظاہر ہوا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ مدینۂ طیبہ میں ایک شخص تھا جو امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق ناشائستہ باتیں کہتا تھا۔ سعید ابن مالک رضی اللہ عنہٗ نے اس کے لیے بددعا کی۔ اس شخص نے اپنے اونٹ کو مسجد کے باہر چھوڑ کر رکھا تھا اور خود مسجد میں آکر لوگوں کے حلقہ کے درمیان بیٹھ گیا۔ وہ اونٹ اپنی جگہ سے کودا، مسجد میں آیا، اور اس شخص کو اپنے سینے کے نیچے رکھ کر زمین پر کچل کر مار ڈالا۔

★ منقول ہے نقل کیا ہے کہ حضرت حسن ابن علی ابن حسین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے انھوں نے فرمایا کہ ابراھیم ابن ہشام مخزومی والی مدینہ تھا۔ ہر جمعہ کے دن ہم کو منبر کے پاس جمع کرتا اور امیر المومنین علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہٗ کو برا بھلا کہتا۔ ایک جمعہ میں وہ جگہ لوگوں سے بھری ہوئی تھی میں منبر سے متصل بیٹھ کر خواب میں مشغول تھا کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کو دیکھا کہ وہ شق ہو گئی ہے اور ایک شخص سفید لباس زیب تن کئے ہوئے وہاں سے نکلے اور مجھ سے فرمایا اے ابو عبداللہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے کیا یہ باتیں تمہیں غمناک نہیں کرتیں۔ میں نے عرض کیا۔ ہاں! کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اپنی آنکھیں کھول کر دیکھو کہ اللہ تعالےٰ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ شخص حضرت علی کا ذکر کرتے ہوئے منبر سے گر پڑا اور مر گیا۔

حضرات خلفاے اربعہ کے فضائل اور کرامات کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ (بقیہ ص۶۲ پر)



نقوشِ طاہر

عقل و دانش اور علم و حکمت کے شاہکار

حضرت مولانا ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادریؒ سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ ویلور

حضرت مولانا ابوالحسن صدرالدین سید شاہ محمد طاہر قادری علیہ الرحمہ سابق ناظم دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور کا یہ مضمون سالنامہ اللطیف ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔

جس میں مضمون نگار نے علم وفضل اور حکمت و دانش سے متعلق حیرت انگیز اور دلچسپ باتیں اور واقعات کو پیش کیا ہے۔ جن سے اہلِ علم اور اربابِ سلطنت کا مقام و مرتبہ اور ان کی حیثیت کا ایک دلفریب تصور ذہنوں میں ابھرتا ہے۔

ناظرینِ اللطیف کی خدمت میں یہ علمی گلدستہ پیش ہے۔

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

اللہ جل شانہٗ کی شانِ کریمی کا فیض ہے کہ علمائے حق کی نرالی شان ہے۔ یہ شرف علمائے امت کو ہی حاصل ہے۔ علمائے امت نے حصولِ علم کی خاطر جس قدر جدوجہد کی۔ سینکڑوں میل پیادہ پا سفر طے کئے اور استقلالِ طبیعت کے ساتھ، دُنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہو کر انھوں نے اسلامی علوم وفنون میں مہارتِ تامہ حاصل کی یہ ان کا بڑا کمال تھا۔ کہ انھوں نے ان علوم وفنون میں کمال پیدا کیا اور دُنیا کے امام کہلائے گئے۔

امام ربیعۃ الرائےؒ نے اپنے والد کی تربیت سے محروم اور ماں کی گود میں پرورش پاتے ہوئے علم کے مدارج طے کرتے گئے آپ حضرت امام مالکؒ اور خواجہ حسن بصریؒ کے استاذ تھے۔ یہ واقعہ بہت دلچسپ اور مشہور ہے کہ امام ربیعۃ الرائےؒ کے والد فروخ، بنی امیہ کے دورِ حکومت میں فوج میں ملازم تھے۔ جس وقت امام ممدوحؒ اپنی والدہ کے

بطن میں تھے ۔ اس وقت خراساں کو خلیفہ دمشق کی جانب سے ایک لشکر روانہ کیا گیا ۔ فروخ کی خدمات اس لشکر کی سپرد کی گئیں ۔ وہ دور اسلامی فتوحات کا دور تھا ۔ اسلامی فرمانروائے وقت کی یہی خواہش تھی کہ برّ و بحر کا زیادہ تر حصہ اسلامی پرچم کے نیچے لایا جائے ۔ فروخ کو اس خراسانی مہم میں ستائیس برس گزر گئے ۔ جس بچّہ کو وہ ان کی والدہ کے بطن چھوڑ گئے تھے ، وہ بچّہ اب بڑا ہو کر ایک جیّد عالم اور وقت کا امام بن چکا تھا ۔ ان فتوحات کے بعد خوش و خرّم فروخ اپنے وطن مدینۂ منوّرہ تشریف لائے تو گھوڑے پر سوار نیزے کی انی سے انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ربیعۃ الرائے نے دروازہ کھولا اور پھر باہر چلے آئے ۔ جوں ہی دروازہ کھلا فروخ بے تکلفی سے اندر جانے لگے ۔ یہ دیکھ کر امام ربیعۃ الرائے کو وحشت ہونے لگی اور انھوں نے للکار کر کہا : اے بڑے میاں تم میرے مکان میں کیسے گھسے جا رہے ہو ؛ فتوحات کا تازہ خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا تھا ۔ لہٰذا فروخ نے طیش میں آ کر کہا : اے خدا کے دشمن ! میرے حرم سرا میں تیرا کیا کام ؟ اس جھگڑے کے دوران آس پاس کے لوگ جمع ہونے لگے ۔ امام مالک بھی اپنے استاذ کا معاملہ سمجھ کر آئے اور پھر انھوں نے مصلحانہ انداز میں کہا : کہ اے بڑے میاں ! آپ کو ٹھہرنا ہی مقصود ہے تو دوسرا مکان بھی موجود ہے ۔ آپ کے اس مصلحانہ انداز سے متاثر ہو کر فروخ نے بتایا کہ اے بھائی ! میرا نام فروخ ہے اور یہ میرا مکان ہے ۔ فروخ کا نام سنتے ہی ربیعۃ الرائے کی والدہ نے پہچان لیا اور فوراً ہی کہنے لگیں " یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں " یہ سنتے ہی باپ بیٹے گلے ملے اور مل کر خوب روئے ۔ بعدازاں اندر داخل ہوئے ۔ فروخ جب اپنی بیوی سے باتیں کر رہے تھے تو اس اثناء میں ربیعۃ الرائے مسجد نبوی ؐ تشریف لے گئے اور مسندِ درس پر متمکن ہو گئے ۔ دورانِ گفتگو فروخ نے اپنی بیوی سے دریافت کیا کہ چلتے وقت ان تیس ہزار اشرفیوں کو جو میں نے چھوڑ گیا تھا ، وہ کیا ہوئیں ؟ بیوی زیرک نے بتایا کہ گھبرائیے نہیں ، محفوظ رکھی ہیں ۔

نماز کے لیے جب فروخ مسجد نبوی ؐ گئے تو دیکھا کہ کوئی شخص وہاں مسندِ درس و تدریس پر جلوہ افروز ہیں ۔ تلامذہ کا وہ ہجوم تھا کہ استاذ کو گھیرے ہوئے تھے ۔ عجیب شان و شوکت کا مظاہرہ تھا ۔ فروخ تھوڑی دیر اس دیدہ زیب و پُر رعب منظر کو دیکھتے رہے ۔ اور پھر انھوں نے حاضرین سے دریافت کیا ۔ کہ یہ شیخ کون ہیں ؟ انھوں نے بتایا کہ یہ امام ربیعۃ الرائے ابن عبدالرحمٰن ہیں ۔ یہ سن کر فروخ کو مسرت کی انتہا نہ رہی اور خوشی سے جھومتے ہوئے مکان تشریف لائے ۔

فروخ نے یہ سارا ماجرا اپنی بیوی کو سنایا ۔ یہ سن کر بیوی نے پوچھا کہ آپ کو کیا زیادہ پسند ہے ؟ بیٹے کی یہ شان یا وہ تیس ہزار اشرفیاں ؟ فروخ نے کہا : واللہ ! بیٹے کی اس شان کو میں زیادہ پسند کرتا ہوں ۔ تو پھر بیوی نے بتایا ۔ کہ ان تیس ہزار اشرفیوں کو میں نے ربیعۃ الرائے کی تعلیم پر صرف کر دی ہے ۔ فروخ نے فرمایا : قسم ہے خدا کی کہ تم نے یہ رقم ضائع نہیں کی ۔ !

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ایک بچّہ باپ کی تربیت سے محروم اور ماں کی پرورش میں اور اس کے سپرد تیس ہزار اشرفیاں

تھیں۔ اس زمانہ کی بی بیوں کا علم سے شغف اور لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بچہ جن کا نام ربیعۃ الرائے تھا بڑے ہو کر اپنے وقت کے زبردست عالم و فاضل اور علم و ادب کے امام بنے اور آپ کے شاگرد خود دُنیا کے نامور امام ہوئے۔

علماء کا یہ جاہ و جلال اور جلالتِ علمی کا اندازہ حسب ذیل واقعات سے بھی لگایا جا سکتا ہے:۔

امیر تیمور نے ایک روز اپنے قاصد کو کسی ضروری کام پر روانہ کیا۔ اور چلتے وقت تاکید کی کہ وقتِ ضرورت راستے میں کسی کی بھی سواری ہو حاصل کرلیں۔ اس قاصدِ سلطانی کو چلتے چلتے راستے میں ایک جگہ سواری کی ضرورت محسوس ہوی اتفاقاً اس وقت پر علّامہ تفتازانیؒ وہاں خیمہ زن تھے۔ یہ اجل گرفتہ قاصد وہاں پہنچ کر بلا اجازت و بغیر اطلاع کے تھان سے ایک گھوڑا کھول لیا۔ اس خبر کے پہنچتے ہی علّامہ تفتازانیؒ اپنے خیمہ سے باہر آئے اور طیش میں آکر اپنے لوگوں سے اس قاصدِ سلطانی کو پٹوا کر باہر نکلوا دیا۔

قاصد واپس ہو کر جب دربار پہنچا تو دربار میں اس نے علّامہ کی شکایت پیش کی۔ اس شکایت کو سُن کر سلطان غیض و غضب میں آگیا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک فرمانروائے وقت کی توہین و بے حرمتی گویا بادشاہِ وقت کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کرنا ہے۔ سلطان اس کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ ہیجانِ غضب میں سلطان کچھ دیر ساکت رہا۔ پھر کہنے لگا: کہ اگر شاہ رُخ ایسی حرکت کرتا تو ضرور سزا پاتا۔ لیکن میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کر سکتا کہ جس کا قلم ہر شہر و دیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کر چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ علمائے حق کے سامنے شاہانِ سلطنت بھی عاجز و بے بس ہو جاتے ہیں۔

مولانا ابنِ خطیب ایک روز عید کی مبارک باد دینے کے لیے ایوانِ سلطانی گئے۔ چلتے وقت چند شاگرد بھی اُن کے ہم رکاب ہوے۔ جب ایوان پہنچے تو سلطان بحسنِ اخلاق و تعظیم و تکریم کی خاطر اٹھا اور آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا خطیب نے بجائے آدابِ شاہی بجالانے کے انھوں نے سلام کیا اور بجائے دست بوسی کے انھوں نے مصافحہ کیا۔ ان کے ایک شاگرد کو یہ حرکت ناگوار گزری اور واپسی پر اس نے استفسار کیا کہ سلطان فرمانروائے وقت ہے اور آپ کو کچھ جھک کر ملنا چاہیے تھا۔ مولانا نے فرمایا: سلطان کے لیے کیا یہ فخر کچھ کم ہے کہ ابنِ خطیب جیسا فاضل اس سے ملنے گیا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یہ اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔

ابنِ سماک کوفی جو اپنے وقت کے مشہور و جیّد عالم تھے۔ ایک وقت تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا میرا بیان کیسا ہے؟ سخن شناس جاریہ نے کہا: تقریر تو اچھی ہے لیکن اتنا نقص تو ضرور ہے کہ تم ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہو۔ ابنِ سماک نے جاریہ سے کہا: میں اعادۂ کلام اس لیے کرتا ہوں کہ جو مخاطب اوّل مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ بھی سمجھ جائیں جاریہ! جب تک کم فہم سمجھیں گے، سمجھنے والے مکدر ہو چکیں گے۔

ابنِ نافع قشیری حافظِ حدیث اپنے مکان پر حدیثِ شریف پڑھایا کرتے تھے۔ اور طلبا کے علاوہ خراساں کے امیر طاہر کے بچّے بھی حاضرِ درس ہوتے تھے شیخ کے جلال کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی کو بات کرنے یا مسکرانے کی تاب و مجال نہ ہوتی۔

ملک عادل سلطان صلاح الدین کا بھائی بڑے دبدبے اور سطوت کا فرماں روا گزرا ہے۔ ایک بار محدّث اسلام عبدالغنی دمشقی اس سے ملنے گئے تھے۔ ملک عادل کا بیان ہے کہ جس وقت حافظ عبدالغنیؒ میرے سامنے آئے تو مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ ایک شیر آگیا ہے۔

ابو عبیدؒ بن سلام نے ایک بار اپنے تلامذہ سے کہا: کہ میں نے چالیس برس اپنی کتاب "غریب الحدیث" کی تصنیف میں صرف کئے ہیں۔ اکثر فوائد مجھ کو لوگوں سے باتوں باتوں میں ہاتھ لگ جاتے تھے اور میں ان کو موقعہ سے اس کتاب میں درج کرتا جاتا تھا۔ ان فائدوں کے حاصل ہونے سے اتنی خوشی مجھ کو حاصل ہوتی کہ میں ساری رات فرطِ مسرّت سے جاگتا رہتا۔ تم چار پانچ مہینے بھی میرے پاس آکر رہتے ہو تو کہتے ہو کہ ہم بہت رہے۔

حضرت امام زہریؒ کا مطالعہ کے وقت یہ عالم ہوتا کہ اِدھر اُدھر کتابیں ہوتیں اور وہ اُن کے مطالعہ میں ایسے مصروف ہوتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔

اللہ تبارک و تعالےٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی برکت سے دنیائے اسلام میں ایسے نفوس قدسیہ کو پیدا فرمایا کہ جن کے نوکِ قلم سے عقل و دانش کے زبردست جواھر پارے معرضِ وجود میں آئے۔ جن سے ایک عالم مستفید ہوتا آرہا ہے

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا　　سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

شیخ سعدی کی شخصیت ایک باکمال و مشہور زمانہ کی شخصیت تھی۔ سعدی علیہ الرحمہ اپنے وقت کے ایک زبردست عالم و باکمال مصنف تھے۔ اس زمانہ میں ایک اور شاعر امامی بھی تھا۔ لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ ان میں سے کون افضلیت و برتری رکھتا ہے۔ ایک اور تیسرا شاعر ہمکر شیرازی نے یہ فیصلہ کیا کہ امامی کو سعدی پر برتری حاصل ہے۔ لیکن یہ اتنا غلط فیصلہ تھا کہ جس کے غلط ہونے کا ثبوت سات سو سال گزرنے کے باوجود برابر ملتا آرہا ہے اس غلط فیصلہ کی تردید اور شیخ سعدی کی افضلیت و برتری کی تصدیق برابر ہوتی آرہی ہے۔

گلستانِ سعدی و بوستان سعدی میں شیخ سعدی نے علم و حکمت کے جواہرات بکھیر دیے ہیں۔ دُنیا کے ہر ادارے میں جہاں فارسی کا درس دیا جاتا ہے، وہاں یہ کتابیں داخلِ درس ہیں اور دُنیا کی بیشتر زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ایسے لوگ اگر دُنیا میں پیدا نہ ہوتے اور ان پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو عقل و دانش اور علم و حکمت کے گلہائے راز سے دُنیا اور بالخصوص دُنیائے اسلام محروم رہتی۔

پیرہمِ حق تا ابدان کا سلامی ہوگیا　　زندہ جاویدان کا نام نامی ہوگیا

موجودہ دَور کے لوگ بھی اگر اسی جذبۂ صادق کے تحت حصولِ علم میں کوشاں رہیں اور استقلالِ طبیعت کے ساتھ دُنیا کے مال و متاع سے بے نیاز ہوکر اسلامی علوم و فنون میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کی سعی بلیغ کریں تو اللہ کی رحمت واسع صفات لا تقنطوا من رحمۃ اللہ سے امیدِ قوی ہے کہ ان کے کارنامے بھی زندہ جاوید ہوں گے (بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

دورۂ کیرلہ

مولانا ڈاکٹر ابو محمد سید شاہ محمد عثمان قادری
ایم اے، پی ایچ ڈی، ناظم دار العلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان ویلور

ہندوستان میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں ساداتِ کرام کا ادب و احترام ابھی بھی باقی ہے۔ کیرلہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ اکثر لوگ ملیالم زبان سے ناآشنا ہونے کی بناء پر اس علاقہ کا دورہ نہیں کرتے اور وہاں کے حالات سے کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ جس کی وجہ سے کیرلہ کی تہذیب و ثقافت، تمدن و کلچر اور اقتصادی و معاشی آسودگی اور خوش حالی اور وہاں کے حسین و جمیل قدرتی مناظر وغیرہ سے نابلد رہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں پٹرول کی دولت وہاں پہنچنے کے باعث کیرلہ کی تہذیب و معاشرت میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ عربوں کی ثقافت و تہذیب کے جلوے ہر سُو بکھرے نظر آتے ہیں۔

ایک موقعہ ایسا آیا کہ تانور کیرلہ کے ایک سید صاحب جن کا نام متو کویا تنگل ہے (کیرلہ میں سیّد کو تنگل کہتے ہیں۔) انھوں نے مجھے رتسیر کے ایک جلسہ میں خطاب کرنے کے لیے دعوت دی۔ سفر میں میرے ساتھ ایک ملیالم طالب علم خالد اور ایک اردو طالب علم سید احمد جو اردو، ٹمل اور ملیالم تین زبان سے واقف تھے، ہم سفر ہوئے۔

ہمارا سفر کاٹپاڑی سے شروع ہوا اور شورونور جو کالی کٹ کے قریب ہے ختم ہوا۔ بارش کی کثرت سے کالیکٹ میں ایک پُل کے گرنے کے باعث ریل گاڑی وہاں تک نہ جا سکی۔ شورونور سے ہمیں بذریعہ کار لے جایا گیا۔

راستہ میں ایک منظر دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ کہ راستے کے دونوں جانب طلباء و طالبات اپنے ہاتھوں میں بستہ لیے ہوئے عربی مدارس کی طرف رواں دواں ہیں۔ ہم نے کسی طالب علم کو کسی سواری یا کسی رہبر کے ساتھ جاتے نہیں دیکھا۔ ایسا مجھے پہلی بار دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ ورنہ ہمارے یہاں مدارس کو بچے اپنے بڑے بھائی، بہن، ماں، باپ وغیرہ کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ بچوں کو بڑے لے جاکر مدرسہ چھوڑ آتے ہیں۔ کیرلہ میں بچوں کے والدین اور سرپرست حضرات اس خدمت سے محفوظ نظر آتے ہیں۔

راستہ میں کہیں بھی ٹی، وی، ایس یا لُونا دیکھنے کو نہیں ملی۔ میرے سوال کرنے پر بتایا گیا کہ راستہ نشیب و فراز کا ہے۔ اس لیے یہاں صرف گیر کی گاڑیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ اور سائیکل تو صرف کم عمر کے بچے ہی چلاتے ہیں۔

شاندار استقبال

تانور پہنچنے پر ہمارا بہت ہی شاندار استقبال کیا گیا۔ ٹھہرنے کی جگہ ایک باتھ اٹاچڈ روم تھا۔ یوں تو پورا تانور ایرکنڈیشنڈ نظر آ رہا تھا۔ لیکن گھر بہت آرام دہ تھا۔ کھانے کا بہترین انتظام تھا۔ رات کو جلسہ گاہ میں جانے کے بعد وہاں بھی بہت اچھا

(بقیہ صفحہ 137 پر)



شہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت

مولانا ابوالحسن محمد رمضان القادری۔ کلیان پوری۔ استاذ دار العلوم لطیفیہ۔ حضرت مکان۔ ویلور

ے مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ میں

سورۂ کہف کی آخری آیت کریمہ میں ہے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: یہی وہ آیت کریمہ ہے جسے بعض لوگ پڑھ پڑھ کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بعض تو یہاں تک حد سے تجاوز کر بیٹھے کہ رسول بھی بشر اور ہم بھی بشر ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ درجہ ذیل مضمون میں اسی آیت کریمہ کے تحت اختصاراً کچھ معروضات و معلومات قرآن و احادیث اور آثار و تشبیہات کی روشنی میں قارئین بزم اللطیف میں پیشِ خدمت ہیں۔

ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

ایک علمی اور درس گاہی بحث

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

اے محبوب تم فرمادو کہ میں تم جیسا بشر ہوں

اس آیت میں قرآن نے رسول کو بشر نہیں کہا ہے بلکہ مثل بشر کہا ہے۔ اگر فکری بصیرت، بالغ نظری اور کاوشِ ذہنی سے کام لیا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے برابری کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے خاطر خواہ جواب اسی جگہ مل سکتا ہے۔ درس و تدریس سے جنھیں واسطہ ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "مثل" تشبیہات میں سے ہے۔ نیز ضابطہ بھی ہے کہ تشبیہ کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) مشبہ (2) مشبہ بہ (3) وجہ شبہ۔

مشبہ اسے کہتے ہیں کہ جسے تشبیہ دی جائے۔ مشبہ بہ اُسے کہتے ہیں کہ جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔ اور وجہ شبہ ان دونوں کے درمیان ایک مخفی اور اور چھپی ہوئی حقیقت ہے یعنی جس کی وجہ سے تشبیہ دی گئی۔ مثلاً

زید آیا۔ آپ نے فرمایا کہ شیر آیا یعنی زید کو شیر سے تشبیہ دی گئی۔ ایسی صورت میں زید کو مشبہ کہیں گے اور شیر کو مشبہ بہ اور تشبیہ شجاعت و بہادری کی بنیاد پر دی گئی۔ یعنی زید کو اس لیے شیر نہیں کہا گیا کہ وہ چار ٹانگ والا ہے۔ بڑے کلے اور جبڑے والا ہے۔ چنگل اور دراز ناخن والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ شجاعت اور بہادری کی بنیاد پر اسے شیر کہا گیا۔

ایسے ہی محبوب کے ہونٹوں کو کہا: "گلاب کی پنکھڑیوں جیسا ہے۔" تو ہونٹ مشبہ ہوا، گلاب کی پنکھڑی مشبہ بہ اور نزاکت وجہ شبہ۔ یہ تشبیہ نرم و نزاکت کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ محبوب کے دانتوں کو موتی جیسا کہا۔ دانت مشبہ ہے، موتی مشبہ بہ اور چمک وجہ شبہ۔

بس ایسے ہی سید کونین صلے اللہ علیہ وسلم کو بشر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سرکار مشبہ اور بشر مشبہ بہ اور بشریت وجہ شبہ ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ وجہ شبہ کی اصلیت مشبہ میں پائی جاتی ہے یا مشبہ بہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح اور عیاں ہے کہ وجہ شبہ کی اصلیت مشبہ بہ میں پائی جاتی ہے اور اس کی کوئی ایک جھلک مشبہ میں نظر آتی ہے۔ یعنی زید کو شیر کہا تو شجاعت اور بہادری کی اصلیت پہلے زید میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل شیر میں ہے اور زید میں بہادری کی جھلک آگئی ہے۔ بس اسی بنیاد پر تشبیہ دے دی گئی۔ ایسے ہی ہونٹ کو گلاب کی پنکھڑی جیسا کہا تو اصل نزاکت ہونٹ میں نہیں ہے بلکہ گلاب کی پنکھڑی میں ہے۔ البتہ ہونٹ میں نزاکت کی جھلک آگئی ہے۔ ایسے ہی دانت اور موتی گویا اصل چمک موتی میں ہے، دانت میں اس کی جھلک آگئی ہے ــــ معلوم ہوا کہ وجہ شبہ کی اصل مشبہ میں نہیں مشبہ بہ میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اب غور فرمائیں کہ سرکار مشبہ ہیں، بشر مشبہ بہ اور بشریت وجہ شبہ۔

یہ تو حقیقت واضح ہو گئی کہ بشریت کی اصل مصطفےٰ میں نہیں پائی جاتی بلکہ بشر میں پائی جا رہی ہے۔

لہٰذا ہم ایسے بشر ہیں کہ جملہ لوازمات بشریت ہمارے ساتھ ہے۔ مثلاً بشر کے جسم کا سایہ ہونا، پسینہ میں بدبو ہونا۔ جمائی آنا۔ بدن پر مکھی بیٹھنا، غفلت کی نیند سونا وغیرہ لوازمات بشریت ہیں ــــ مگر سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم بشر نہیں بلکہ مثل بشر ہیں۔ اس لیے کہ ان کے جسم کا سایہ نہیں، پسینہ میں بدبو کی بجائے خوشبو ہے۔ جمائی کا نہ آنا، بدن پہ مکھی کا نہ بیٹھنا، غفلت کی نیند نہ سونا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار سو کر اٹھے وضو نہ فرمایا اور نماز ادا فرمائی۔ سرکار سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپ نے بغیر وضو کے نماز ادا فرمائی تو آقا نے فرمایا: میری آنکھیں بند رہتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ تم سوتے ہو تو استرخاء اعضا ہوتا ہے۔ تمہارے بدن کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ تمہیں خبر تک نہ ہوتی کہ ریاح خارج ہوئی یا نہیں؟ دراصل نیند ناقض وضو نہیں ہے بلکہ نیند کی وہ غفلت جس سے اتنا بھی پتہ نہیں چلتا کہ ریاح خارج ہوئی یا نہیں؟ اس لیے شریعت نے نیند ہی کو ناقض وضو قرار دیا ہے۔

اگر سرکار ہمارے ہی جیسے بشر ہوتے تو ان کے بھی پسینہ میں بدبو ہوتی۔ کنکریوں پر قدم رکھتے تو چبھن محسوس ہوتی مگر چبھن تو درکنار کنکریوں نے موم ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنے کلیجہ پر نقش قدم لے لیا۔ اسی کو عارف باللہ سرکار آسی علیہ الرحمۃ والرضوان

فرماتے ہیں: ؎

نہ میرے دل، نہ جگر پر نہ دیدۂ تر پر
کرم کرتے جو نشانِ قدم تو پتھر پہ

لہٰذا معلوم ہوا کہ سرکار میں بس چہرے مہرے کی جھلک آگئی ہے۔ اسے خوب ذہن نشین کرلیجیے کہ بشریت کی اصل ہم میں ہے، سرکار میں نہیں۔

اس آیت کا مطلب

بہرحال قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ بلاشبہ قرآن کی آیت ہے جس پہ ہمارا ایمان ویقین ہے۔ مطلب آپ کے سامنے وضاحت کے ساتھ عرض ہے۔

سب سے پہلے قابلِ غور بات یہ ہے کہ آخر رسول کس بات میں ہمارے مثل ہیں؟ اور رسول کے ساتھ ہماری مماثلت اور مساوات کا معیار کیا ہے؟ کیا اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ!! رسول کے اعضائے بدن آنکھ، ناک، کان وغیرہ کے افعال وخواص ہمارے اعضاء کے افعال وخواص ہمارے اعضاء کے افعال وخواص کے مثل ہیں۔ اگر بشر مثلکم کا یہ مطلب لیا جاے تو ظاہر ہے کہ یہ بالکل ہی غلط ہے کیوں کہ حضور کے اعضاے مبارک کے افعال وخواص ہرگز ہرگز ہمارے اعضائے بدن کے مثل نہیں ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضور کے جسم کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔ اور ہمارے جسم کا سایہ پڑتا ہے۔ رسول کے جسمِ اطہر پہ کبھی مکھی نہیں بیٹھتی تھی اور ہمارے بدنوں پہ ہزاروں مکھیوں کی بارات بیٹھا کرتی ہے۔ رسول کا پسینہ مشک وعنبر اور گلاب سے بھی زیادہ خوش بودار تھا اور ہمارے پسینوں میں بدبو ہوا کرتی ہے۔ رسول کی صرف آنکھیں سوتی ہیں دل بیدار رہتا ہے۔ ہماری آنکھیں بھی محوِ خواب رہتی ہیں اور دل بھی خواب میں پڑا سوتا رہتا ہے۔ الغرض حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے اعضائے مبارکہ کے افعال وخواص میں سارے جہاں کا کوئی انسان بھی نہ مثل ومساوی ہے نہ قیامت تک ہوگا۔ لہٰذا انما انا بشر مثلکم کا یہ مطلب ہو کہ رسول کے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں ہمارے کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں کے مثل ہیں یہ مطلب تو درست ہو سکتا ہی نہیں۔ تو پھر

آیت کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ مطلب ہے کہ! رسول احکام شریعت میں ہمارے مثل ہیں؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ مطلب صحیح نہیں ہو سکتا ہے کیوں کہ حضور سید عالم پہ تہجد کی نماز فرض تھی، ہم پہ نمازِ تہجد فرض نہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے چار سے زیادہ بیویاں جائز تھیں۔ ہمارے لیے چار سے زیادہ حلال نہیں، حضور اکرم کا وضو نیند سے نہیں ٹوٹتا تھا۔ ہمارا وضو سو جانے سے شکست ہو جاتا ہے۔ غرض بہت سے احکامِ شریعت ایسے ہیں جو حضور کے ساتھ خاص ہیں۔ لہٰذا کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور احکام شریعت میں ہمارے مثل ہیں۔ بہرکیف جب جسمانی افعال وخواص یا احکام شریعت، کسی بات میں بھی دنیا کا کوئی انسان حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مثل نہیں ہے تو پھر یہ قابلِ غور بات ہے کہ قرآن کی آیت کریمہ انما انا بشر مثلکم کا کیا مطلب ہے یعنی نبی اور عام انسانوں کے درمیان مماثلت ومساوات آخر کون سی بات میں ہے؟

پھر خصوصًا ایسی صورت میں جب کہ ان صحیح حدیثوں پر بھی ہم نظر رکھیں، جن میں بار بار حضور سید کونین صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم

نے یہ فرمایا ہے کہ اَیُّکُم مِثلی (مشکوۃ: کتاب الصوم) یعنی تم میں سے کون ہے جو میرے مثل ہے؟ کہیں یوں ارشاد فرمایا ہے کہ لَسْتُ کَاَحَدٍ مِنْکُمْ۔ اب ان دونوں احادیث مبارکہ کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن کی آیت انما انا بشر مثلکم کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ یہ ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ رسول ہمارے مثل ہیں اور حدیثیں اعلان کررہی ہیں کہ تمام دنیا میں کوئی انسان بھی رسول کے مثل نہیں ہے۔ نبی کی شانِ بے مثالی کا کیا کہنا۔ پروردگار عالم نے تو نبی کی ازواجِ مطہرات کے بارے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ: یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب) اے نبی کی بیویو! تم کسی عورت کے مثل نہیں ہو۔ جب نبی کے بسترِ نبوت پر سونے والی ازواجِ مطہرات، تمام دنیا کی عورتوں میں بے مثل و بے مثال ہیں، تو پھر بھلا نبی تمام انسانوں کے مثل کیوں کر اور کس طرح ہوسکتا ہے۔ بہر کیف ہمیں ان تمام وجوہات کو ذہن میں رکھ کر ہمیں انما انا بشر مثلکم کے معنی اور مفہوم پر غور کرنا ہے۔

شیخ محقق کی تحقیق

حضرت شیخ عبد الحق محدّث دہلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ہمہ گیر شخصیت عالم اسلام کے لیے بہ وہ مسلّم الثبوت، جامع العلوم ہیں کہ ان کی تصنیفات امّتِ مسلمہ کے لیے ہدایت کا آفتاب ہیں۔ اس علم و عمل کے کوہ ہمالیہ نے انما انا بشر مثلکم کے آیت کے بارے میں کیا تحقیق فرمائی ہے؟ آپ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مدارج النبوت" کی جلد اول باب سوم، وصل ازالۂ شبہات' میں تحریر فرمایا ہے کہ: "درحقیقت متشابہات اند۔" یعنی انما انا بشر مثلکم اور اس قسم کی دوسری آیتیں، یہ آیات متشابہات میں سے ہیں۔ یعنی اللہ اور رسول کے سوا تمام عالم میں کسی کو ان آیتوں کے حقیقی معانی و مطالب کا علم ہی نہیں ہے۔

جب انما انا بشر مثلکم کی آیت متشابہات میں سے ہے تو پھر جس طرح تمام آیاتِ متشابہات کے ظاہری معنی مراد نہیں لیے جاسکتے، اسی طرح اس آیت کے بھی ظاہری معنی مراد لینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ مثلاً جس طرح یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ میں خدا کا ہاتھ ہونا اور فثم وجہ اللّٰہِ میں خدا کا چہرہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر چوں کہ یہ آیات متشابہات میں سے ہیں۔ اس لیے اس کے ظاہری معنی مراد لینا قطعاً غلط ہے۔ بلکہ ان آیتوں کے بارے میں شریعت کا یہی حکم ہے کہ یوں کہا جائے کہ ید اللہ (خدا کا ہاتھ) اور وجہ اللہ (خدا کا چہرہ) سے خدا کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس سے خدا کی کیا مراد ہے؟ اس کو ہم نہیں جان سکتے۔ اس کو اللہ اور رسول ہی جانتے ہیں۔ اسی طرح انما انا بشر مثلکم کے بارے میں بھی یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اس سے جو کچھ بھی اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اللہ نے اس سے کیا مراد لیا ہے؟ اس کو ہم جان نہیں سکتے۔ اس کا علم اللہ اور رسول ہی کو ہے۔ آیاتِ متشابہات کے بارے میں اللہ فرماتا ہے: لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ۔ (خطباتِ عبد المصطفےٰ اعظمی علیہ الرحمہ)

حضرت شیخ محقق کی اس تحقیق کی بنیاد پر سید عالم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا جیسا بشر کہنا گستاخی ہے۔ کیوں کہ آیاتِ متشابہات میں سے کسی مسئلہ پر استدلال اور دلیل پکڑنا جائز ہی نہیں ہے۔ اللہ اور رسول کے سوا تمام عالم میں کوئی بھی آیاتِ

متشابہات کے معنٰی اور مراد کو نہیں جان سکتا ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

قرآن فرماتا ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ: اے محبوب فرمادو کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔ اس آیتِ قرآنیہ سے معلوم ہوا کہ حضور بھی ہماری طرح بشر ہیں، اگر نہیں ہیں تو آیت (معاذاللہ) جھوٹی ہو جائے گی۔ جواب: اس آیت میں چند طرح غور کرنا لازم ہے۔ ایک یہ کہ فرمایا گیا قُلْ: اے محبوب آپ فرمادو۔ تو یہ کلمہ فرمانے کی صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اجازت ہے کہ آپ بطور انکسار و تواضع فرمادیں، یہ نہیں کہ قولوا انّما ھُوَ بَشَرٌ مِّثْلُنَا: اے لوگو! تم کہا کرو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہم جیسے بشر ہیں۔ بلکہ قُلْ میں اس جانب اشارہ ہے کہ بشر وغیرہ کلمات تم کہہ دو، ہم تو نہ کہیں گے، ہم تو فرمائیں گے شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِيرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ ہم تو فرمائیں کے یاایّھا المزمل، یاایّھا المدثر وغیرہ نیز اس آیت میں کفار سے خطاب ہے۔ چوں کہ ہر چیز اپنی غیر جنس سے نفرت کرتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ: اے کفار تم مجھ سے گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری جنس سے ہوں، یعنی بشر ہوں۔ شکاری جانوروں کی سی آواز نکال کر شکار کرتا ہے اس سے کفار کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔ اگر معترضین بھی کفار میں سے ہی ہیں۔ توان سے بھی یہ خطاب ہو سکتا ہے۔ ہم مسلمانوں سے فرمایا گیا اَیُّکُمْ مِثْلِی طوطے کے سامنے آئینہ رکھ کر اور خود آئینہ کے پیچھے کھڑے ہو کر بولتے ہیں تاکہ طوطا اپنا عکس آئینہ میں دیکھ کر سمجھے کہ یہ میرے جنس کی آواز ہے۔ انبیائے کرام رب کا آئینہ ہیں آواز و زبان ان کی ہوتی ہے اور کلام ربّ کا۔

دوسرے اس طرح کہ تفسیر روح البیان سورۂ مریم میں کھٰیٰعٓصٓ کے ماتحت ہے کہ حضور علیہ السلام کی تین صورتیں ہیں، صورتِ بشری، صورتِ حقی اور صورتِ ملکی۔ بشریت کا ذکر انما انا بشر میں ہے۔ حق کا ذکر ہوا من رانی فقد راالحق: جس نے ہم کو دیکھا حق کو دیکھا۔ صورتِ ملکی کا ذکر فرمایا: لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِیْ فِیْهِ مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ وَّلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ: بعض وقت اللہ سے ہم کو وہ قرب ہوتا ہے کہ نہ اس میں مقرب فرشتہ کی گنجائش ہے نہ مرسل نبی کی۔ معراج میں سدرہ پہنچ کر طاقتِ جبرئیل ختم ہو گئی۔ مگر سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بشری طاقت کی ابھی ابتدا تھی۔ اس آیت میں محض ایک صورت کا ذکر ہے۔

تیسرے اس طرح کہ بشرٌ مثلکم میں یہ تو فرمایا: ہم تم جیسے بشر ہیں۔ یہ نہ فرمایا کہ کس صفت میں تم جیسے ہیں۔ یعنی جس طرح تم محض بندے ہو نہ خدا ہو نہ خدا کے بیٹے، نہ خدا کی صفات سے موصوف۔ اسی طرح میں عبداللہ ہوں۔ نہ اللہ ہوں نہ ابن اللہ۔ عیسائیوں نے چند معجزات دیکھ کر عیسٰی علیہ السلام کو ابن اللہ کہہ دیا۔ تم ہمارے صدہا معجزات دیکھ کر یہ نہ کہہ دینا بلکہ کہنا عبداللہ ورسولہ (تلخیص جاءالحق وزہق الباطل: حکیم الامت مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی علیہ الرحمہ)

امام رازی کی ایک تفسیر ملاحظہ فرمائیں

عالم اسلام کے ایک مسلم الثبوت مفسر حضرت امام فخرالدین رازی علیہ الرحمہ اپنی مشہور کتاب "تفسیر کبیر" میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے

تحریر فرماتے ہیں کہ : اَمَرَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلّم بِاَنْ یَسْلُكَ طَرِیْقَةَ التَّوَاضُعِ ۔ (تفسیر کبیر، ج:۵، ص:۵۱۶)
یعنی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ تواضع اور انکساری کی راہ پر چلیں اور اپنے بے شمار فضائل و کمالات کے باوجود اپنی امّت سے بطور تواضع یہ فرمائیں کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یعنی میں تو تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔

یہاں اللہ نے اپنے رسول کو اس آیت میں انکسار و تواضع کی تعلیم دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اے محبوب آپ لوگوں سے بطور تواضع یہ فرمائیں کہ میں تم لوگوں جیسا ایک بشر ہوں اور حضور نے تعلیمِ خداوندی کے بموجب اپنی امت سے ازراہِ تواضع یہ فرمایا کہ اے لوگو! انّما انا بشرٌ مّثلکم۔ مگر چوں کہ یہ انکسار و تواضع کے کلمات و الفاظ ہیں اس لیے امت کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی یہ کہنے لگے کہ رسول تو ہمارے جیسے ایک بشر ہیں اور یہ دلیل پیش کرے کہ خدا نے تو خود رسول کو بشرٌ مثلکم کہنے کا حکم دیا ہے اور خود رسول نے یہ کہا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ان کو اپنے جیسا بشر کہیں گے۔ توبہ نعوذ باللہ۔!

قابلِ غور

خدا نے اپنے رسول کو اس آیت میں انکساری و تواضع کی تعلیم دی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ اے محبوب آپ لوگوں سے بطور تواضع یہ فرمائیں کہ میں تم لوگوں جیسا ایک بشر ہوں اور حضور نے تعلیم خداوندی کے بموجب اپنی امّت سے ازراہِ تواضع یہ فرمایا ہے کہ لوگو! اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ مگر یہ الفاظ و کلمات انکسار و تواضع کی بنیاد پر ہیں۔ لہٰذا امّت کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی یہ کہنے لگے کہ رسول تو ہمارے جیسے ایک بشر ہیں اور یہ دلیل پیش کرے کہ خدا نے تو خود رسول کو بشر مثلکم کہنے کا حکم دیا ہے اور خود رسول نے یہ کہا ہے۔ لہٰذا ہم بھی ان کو اپنا جیسا بشر کہیں گے تو یہ نعوذ باللہ۔

بہر کیف حضرت امام فخر الدین رازی کی تفسیر سے یہ مسئلہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ بشرٌ مثلکم کی آیت رسول کی تواضع کا ایک نمونہ ہے۔

بلا تشبیہ و تمثیل یوں ذہن نشیں فرمائیں کہ اللہ رب العزّت نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جب ہر فضل و کمال سے آراستہ فرما کر اس شان سے دنیا میں بھیجا کہ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کی سند، خاتم النبیین کی مہر، سید المرسلین کا خطاب، شفیع المذنبین کا تاجِ کرامت عطا فرمایا، تو اپنے حبیب صلے اللہ علیہ وسلّم کو تواضع اور انکساری کی تعلیم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے محبوب! تم یقیناً سید المرسلین بھی ہو اور خاتم النبیین بھی ہو اور رحمۃ للعٰلمین بھی ہو اور شفیع المذنبین بھی، تم محبوبِ ربّ العالمین بھی ہو اور طٰہٰ و یٰسین بھی۔ مگر اتنے کمالات و فضائل کے باوجود جب تم اپنی امّت کے عوام سے خطاب فرمانا تو ازراہِ تواضع یہی فرمانا " اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "؛ ہاں البتہ جب اُمّت کے خواص اور مرتبہ شناسانِ نبوت کی جھرمٹ میں رہنا تو نعمتِ خداوندی کے اظہار کے لیے کبھی کبھی یہ بھی اعلان فرما دینا کہ اَنَا سَیِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ یعنی میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں اور میں یہ فخر کے طور پر نہیں کہتا بلکہ شکر کے طور پر کہتا ہوں۔

لہٰذا رسول کو اپنا جیسا بشر کہنا اس آیت کو بنیاد بنا کر ہرگز ہرگز درست نہیں ہے۔

قرآن میں ایک جگہ اس طرح آیت ہے: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ۔ یعنی زمین کا ہر جانور اور ہر پرندہ، یہ تمہارے ہی جیسی امتیں ہیں۔ دیکھیے یہاں بھی "مثل" کا لفظ اور "ما و اِلّا کلمہ حصر موجود ہے۔ جو "اِنَّمَا" کے معنی میں ہے۔ مگر کیا اس آیت سے دلیل پکڑ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر انسان بکرے اور کوّے جیسا ہے یا ہر بکرا اور کوّا انسان جیسا ہے۔ اگر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے تو بشرٌ مثلکم سے بھی دلیل پکڑ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول ہمارے جیسے بشر ہیں یا ہم رسول جیسے بشر ہیں۔۔۔ اس جگہ یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اگر یہ آیت تواضع کے لیے نہ بھی ہو، تو اس کلام کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر ہر بات اور ہر ہر صفات میں تمہارے مثل بشر ہوں بلکہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کا صرف یہی اتنا مطلب ہو سکتا ہے کہ جس طرح تم سب لوگ خدا نہیں ہو، خدا کے بیٹے نہیں ہو، جن نہیں ہو، فرشتے نہیں ہو بلکہ تم سب لوگ بشر ہی ہو اسی طرح میں بھی نہ خدا ہوں، نہ خدا کا بیٹا ہوں، نہ جن ہوں نہ فرشتہ ہوں بلکہ میں بھی تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ اس کلام سے یہ ثابت نہیں کہ ہر شخص یہ کہتا پھرے کہ رسول تو ہمارے جیسے ایک بشر ہیں۔ معاذ اللہ! کہاں ہم جیسے ننگِ بشر کی بشریت، اور کہاں افضل البشر اور سید البشر کی بشریت!؟ ؎

مُحَمَّدٌ بَشَرٌ لَا كَالْبَشَرِ — بَلْ كَيَاقُوْتٍ بَيْنَ الْحَجَرِ

بے شک رسول بھی بشر ہیں اور ہم بھی بشر ہیں۔ مگر ہم ایسے بشر ہیں کہ سو جائیں تو دین و دنیا سے بے خبر غافل اور جاگیں تو معرفتِ الٰہی سے جاہل اور رسول ایسے بشر ہیں کہ: ؎

وہ سو جائیں تو معراجِ منامی — وہ جاگیں تو خدا سے ہم کلامی

ہم ایسے بشر ہیں کہ فرشتے مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ کہہ کر ہمیں فسادی اور خونریز جیسے تحقیر آمیز الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور رسول ایسے بشر ہیں کہ ملائکہ مقربین انھیں دیکھ کر زبانِ حال سے یوں پکارا کرتے ہیں کہ: ؎

اے ہزاراں جبرئیل اندر بشر — بہرِ حق سوئے غریباں اک نظر

اور کسی نے اس طرح فرمایا: ؎

ہزاروں جبرئیل ایسے ہوئے ہیں گردِ منزل میں — نہ جانے کس قدر اونچا ہے کاشانہ محمد کا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت تو وہ عظمت مآب ہے کہ آپ اسی لباس بشریت میں عرش الٰہی کو پامال کرتے ہوئے جب قرب الٰہی کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچے تو آپ کی اس عظمتِ بشریت کو دیکھنے والے فرشتوں کا یہ حال ہو گیا کہ: ؎

جب سے دیکھا ہے لباسِ بشری میں تم کو — ہر فرشتے کی تمنا ہے کہ انسان ہو جائے

رسول کو بشر کہنا کفار کی بولی ہے

قرآن کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سب سے پہلے جس نے اللہ کے نبی کو "بشر" کہا وہ شیطان تھا۔ چنانچہ قرآن کا بیان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کا حکم فرمایا، تو تمام فرشتے فوراً ہی سربسجود ہو گئے، لیکن شیطان اکڑ گیا

اور اس نے سجدہ نہیں کیا اور جب اللہ نے اس سے پرسش فرمائی کہ تو نے کیوں نہیں سجدہ کیا؟ تو شیطان نے جواب دیا: قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ہ شیطان نے کہا مجھے زیبا نہیں ہے کہ ایک "بشر" کو سجدہ کروں؛ جس کو تو نے بجتی ہوئی مٹی سے بنایا۔ جو سیاہ بودار گارے میں سے تھی۔ (سورۂ حجر) سب سے پہلا گستاخ و بدنصیب جس نے اللہ کے ایک نبی حضرت آدم علیہ السلام کو "بشر" کہا، وہ "ابلیس" تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو "بشر" کہنا، یہ شیطان کی بولی ہے۔ اب ذرا کفار کی بولی بھی گوش گزار فرمائیں۔ چناں چہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو عذابِ خداوندی سے ڈرایا تو اُن کی قوم کے کافروں نے کیا جواب دیا! اس کو قرآن کی زبان سے سماعت فرمائیں: فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا: یعنی ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے انھوں نے کہا کہ ہم تو تمہیں اپنا ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ ابراہیم میں ہے کہ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود کے کافروں نے سب نے اپنے اپنے پیغمبروں سے یہی کہا کہ: اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: یعنی تم لوگ تو ہمارے ہی جیسے 'بشر' ہو تم لوگ چاہتے ہو کہ ہمارے باپ دادا کے معبودوں سے ہمیں باز رکھو، تو تم کوئی روشن دلیل ہمارے پاس لاؤ۔

خدا کے نبیوں کو بشر کہنا یہ شیطان اور کفار ہی کی تو بولی ہے۔ یہ اہلِ ایمان کی بولی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہرگز ہرگز کسی مومن نے کسی نبی کو اس طرح حقارت کے ساتھ 'بشر' نہیں کہا۔ اور اگر کسی مومن نے کبھی حضور کو بشر کہا ہے تو یہی بتانے کے لیے کہ حضور خدا نہیں۔ جن نہیں تھے، فرشتہ نہیں تھے بلکہ بشر یعنی انسان اور آدمی تھے۔

مولانائے رومؒ فرماتے ہیں: ؎

کافراں گفتند احمد را بشر　　　این نمی دیدند از وشق القمر

کافروں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بشر کہا اور یہ نہیں دیکھا کہ ان کے اشارے سے چاند شق ہو گیا۔

مولانا رومی نے ایک دوسرے موقعہ پر اس طرح ارشاد فرمایا کہ: ؎

گفت اینک ما بشر ایشاں بشر　　　ما و ایشاں بستہ خوابیم و خور

این ندانستند ایشاں از عمیٰ　　　ہست فرقے درمیاں بے انتہا

یعنی کافروں نے یوں کہا کہ ہم بھی بشر ہیں اور انبیاء بھی بشر ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اندھے پن سے اتنا بھی نہیں جانا کہ ہم میں اور خدا کے نبیوں میں بے انتہا فرق ہے۔

بے ادبی اور گستاخی سے پرہیز لازمی ہے

جہاں جہاں پروردگارِ عالم نے اپنے نبیوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم لوگ اپنے کو بشر کہو یا تو یہ آیت متشابہات میں سے ہیں یا ان آیتوں میں حضرت حق جل جلالہٗ نے اپنے مقدس انبیاء کو تواضع و انکساری کی تعلیم دی ہے اور جہاں جہاں انبیاء علیہم السلام نے

اپنے کو بشر کہا ہے، یا تو تواضع کے طور پر کہا ہے یا یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ میں خدا، یا خدا کا بیٹا نہیں ہوں، جن نہیں ہوں، فرشتہ نہیں ہوں بلکہ ایک بشر ہوں۔ یعنی انسان اور آدمی ہوں۔ اور جہاں جہاں کفار نے انبیاء کو بشر کہا ہے ــ وہ حقارت اور توہین ہی کے طور پر کہا ہے۔ لہذا اس دور میں بھی جو حضور سید عالم صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے تمام عظمت اور وقار والے خطاب والقاب کو چھوڑ کر انھیں بشر کہا کرتے ہیں۔ درحقیقت توہین و بے ادبی اور گستاخی کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہو سکتا۔

لہذا بشر اور آدمی جیسے عامیانہ الفاظ سے یاد کرنا یقیناً ان کی توہین اور بے ادبی ہے۔ اور رسول کو ایسے عام لفظوں سے یاد کرنے والے دربار رسالت اور سرکار جلالت کے مجرم ٹھہریں گے۔ اور انھیں قہر و قہار کی عدالت سے ضرور سزا ملے گی۔ نازیبا الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز ضروری ہے۔

نتیجۂ تحریر

ان ارشادات اور توضیحات سے شہنشاہ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقام بشریت ظاہر ہو گیا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ کی آیت متشابہ ہے۔ اس سے جو ظاہر ہے وہ مراد نہیں، اور جو مراد ہے وہ ظاہر نہیں۔ نیز اس آیت کو بنیاد بنا کر رسول اکرم صلے اللہ تعالے علیہ وسلم کو اپنی جیسی بشریت پر اطلاق کرنا ہرگز ہرگز درست اور صحیح نہیں ہے۔ مقام بشریت مصطفےٰ کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ — بعد از خدائے بزرگ توئی قصہ مختصر

• فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں — خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

• یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے — جو کچھ ہوا بیاں وہ آغاز باب ہے

اللہ تعالے حق بات قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ وسلم۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

صفحہ نمبر ۱۱۴ کا بقیہ: "جنات کا قبول اسلام"

حاصل کلام!

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پہ انسانوں کی طرح جنات میں سے بھی بعض ایمان لائے ہیں اور جن مخلوق کا وجود یقینی ہے۔ اور وہ کوئی خیالی اور وہمی تصوّر نہیں ہے۔ قرآن اور احادیث میں ان کے بارے میں بڑی تفصیلات موجود ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین



حوضِ کوثر

مولوی قاری ایم۔بی۔ شیخ فضل اللہ لطیفی، ایم۔اے، استاذ دارالعلوم لطیفیہ، حضرت مکان، ویلور

کوثر کیا ہے!

الکوثر ایک زبان کے لفظ کے مفہوم کو دوسری زبان میں مکمل طریقہ سے ادا نہیں کیا جا سکتا البحر المحیط میں کوثر کے متعلق چھبیس ۲۶ اقوال ذکر کئے گئے ہیں۔ اس لفظ میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں ہر قسم کی دینی و دنیاوی راحتیں حسی اور معنوی نعمتیں داخل ہیں۔ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے طفیل آپ کی امت کو ملنے والی ہیں۔ ان میں سے ایک حوضِ کوثر بھی ہے، جس سے آپ امتیوں کو جنت میں سیراب فرمائیں گے۔ اللّٰھم اعطنا منھا۔

کوثر کثیر سے ماخوذ ہے۔ جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ مگر موقعہ استعمال کے لحاظ سے محض کثیر ہی کے معنیٰ نہیں ہیں بلکہ خیر کثیر کے معنیٰ ہیں۔ یعنی بے شمار بھلائیوں اور نعمتوں کی کثرت مراد ہے۔

تحقیق و ترکیب

الکوثر سے حوضِ کوثر مراد ہے یا فوعل کا وزن کثرت اور مبالغہ کے لیے ہے۔ جیسے نفل سے نوفل۔ کوثر کا موصوف خیر محذوف ہے۔ اس میں علم و عمل اور دونوں جہاں کی ہر قسم کی بھلائی داخل ہے۔ بعض نے آپ کی اولاد اور پیروکار اور علماء امت اور قرآنِ کریم کو بھی داخل کیا ہے۔

کوثر کی تفسیر حوضِ کوثر اور خیر کثیر سے کی گئی ہے۔ اور ایک تفسیر کا دوسری تفسیر میں داخل ہونا بھی آیا ہے۔ اور بعض احادیث سے اس نہر کا جنت میں ہونا اور بعض سے میدانِ حشر میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تطبیق کی صورت یہ کہ اصل نہر جنت میں ہے اور اس کی شاخ محشر میں ہوگی۔

کوثر عطا ہونے کی وجہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحب زادے حضرت قاسم تھے۔ ان سے چھوٹی زینب تھیں۔ ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے۔ ان سے چھوٹی ام کلثوم پھر رقیہ پھر فاطمہ تھیں۔ پہلے حضرت قاسم کا، پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا تو اس پر عاص نے کہا: ان محمداً ابتر لا ابن لہٗ یقوم مقام بعدہ فاذا مات

انقطع ذکرہ واسترحتم منہ۔

کفارِ قریش کہا کرتے تھے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ، ابتر ہیں۔ وہ ان کی حیثیت ایک بے کس و بے بس انسان کی سی ہو گئی ہے۔

عکرمہ کی روایت ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ اسلامی کے جواب میں کفارِ قریش کہنے لگے۔ ابتر محمد منا یعنی محمد اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ کچھ مدت بعد وہ درخت سوکھ کر پیوندِ خاک ہو جائے گا۔

محمد ابنِ اسحاق کی روایت ہے کہ عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا اجی چھوڑو انھیں۔ وہ تو ابتر ہیں، ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں کہ گھر کا چراغ روشن ہو۔ مر جائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا یہ توقع دشمن کے خوش ہونے کا نہیں تھا۔ مگر خوش ہو رہے ہیں۔ کون ؟ آپ کے چچا ابو جہل و ابو لہب اور عقبہ بن ابی معیط وغیرہ۔ کچھ ٹھکانہ نہیں ہے اس کمینہ پن اور دنائت کا۔

چوں کہ نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم توحیدِ خالص کی دعوت دیتے اور صرف اللہ کی عبادت وطاعت کی تلقین فرماتے تھے۔ اور لوگوں کے شرکیہ افعال کا کھلے بندوں رد فرماتے تھے۔ جس سے کفارِ قریش اور عرب کے لوگ آپ سے بگڑ گئے اور لوگوں نے آپ کا سوشیل بائیکاٹ کر دیا۔ آپ کے مٹھی بھر ساتھی بھی سب سے الگ کر دیے گئے۔ اس پر مزید دو صاحب زادوں کی وفات نے غموں کا پہاڑ توڑ دیا اور ایسے وقت جب کہ دشمن کا جگر بھی شق ہو جائے۔ عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلہ اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی اور دلسوزی کے بجائے الٹی خوشیاں منائی جا رہی ہیں اور وہ حرکتیں کی جا رہی ہیں جو ایک غیرت مند شریف انسان کے لیے دل توڑنے والی تھیں۔ جس نے اپنے تو اپنے غیروں تک سے ہمیشہ نیک سلوک کیا تھا۔

چناں چہ آپ کے حالات پر نظر ڈالی کہ دشمن یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ہر حیثیت سے تباہ ہو چکے ہیں۔ قوم سے کٹ کر تن تنہا رہ گئے ہیں، تجارت برباد ہو گئی، نرینہ اولاد سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ بات بھی ایسی لے کر اٹھے کہ مکہ تو در کنار پورے عرب میں بھی چند گنے چنے آدمیوں کو چھوڑ کر کوئی بھی اس کو سننا تک گوارہ نہیں کرتا تھا۔ اس لیے آپ کے مقدر میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ جیتے جی ناکامی و نامرادی سے دوچار رہیں اور جب وفات پا جائیں تو دنیا میں آپ کا نام لیوا بھی کوئی نہ ہو۔

ان حوصلہ شکن اور دل سوز حالات میں سورۂ کوثر نازل ہوئی جس میں آپ کو بڑی تسلّی دی گئی اور آپ کے طبعی ملال و تکدر کو دور فرمایا گیا۔ اور آپ کے جو مخالف جن خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں ان کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ کیوں کہ جو نعمتیں ہم نے آپ کے لیے مقدر کر دی ہیں ان پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو بہت کچھ عطا ہوا ہے نبوت ورسالت، علوم وحکمت، قرآن واخلاق کی دولت سے سرفراز فرمایا گیا۔ دین وشریعت کا مکمل اور جامع نظام

عنایت کیا گیا۔ جس سے ایسی نسل اور امّت تیار ہوگی جو رہتی دُنیا تک آپ کا نام روشن کرے گی اور آپ کے پیغام کو عالمگیر بنائے گی اور ہمیشہ کے لیے دینِ حق کی علمبردار بن جائے گی۔ جس سے زیادہ نیک و پاکیزہ اور بلند پایہ انسان دُنیا میں کسی امّت کو نہیں ملے۔

پیش گوئی پوری ہوگئی

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے حیاتِ مبارکہ ہی میں اپنی دعوت کو انتہائی کامیاب دیکھ لیا۔ اور آپ کے ہاتھوں ایسی جماعت تیار ہوگئی جو دُنیا پہ چھاجانے کی طاقت رکھتی ہے۔ آپ کی نرینہ اولاد نہ رہنے سے دشمن یہ سمجھتے تھے کہ آپ کا نام ونشان دُنیا سے مٹ جائے گا۔ مگر اللہ نے صرف یہی نہیں کہ روحانی اولاد کے ذریعہ آپ کے نام اور کام کو زندہ جاوید بنادیا بلکہ آپ کی صرف ایک ہی صاحب زادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خاتونِ جنّت سے جسمانی اولاد دُنیا میں پھیلادی۔ جس کے لیے آپ کا انتساب بڑا سرمایۂ افتخار ہے۔ یہ تو دُنیا کی وہ نعمتیں ہیں جو اللہ نے اپنے حبیب پاک صلے اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کو یہاں عطا فرمائی ہیں۔ جن کے مخالفین نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ لیکن کوثر کے سلسلہ میں جو آخرت کی نعمتیں اور مراتبِ عالیہ آپ کو حاصل ہوں گے۔ ان کا کوئی شمار نہیں۔ انہی میں سے حوضِ کوثر اور نہر کوثر بھی ہے۔ جس کا ذکر کثیر روایات میں آیا ہے۔

حوضِ کوثر ہو یا نہرِ کوثر، شفاعتِ کبریٰ ہو یا مقام محمود جس سے آپ کی مرتبتِ شان کا اظہار مقصود ہے جس کا ظہور نبوتِ کبریٰ کی صورت میں دُنیا میں ہوچکا ہے اور عرب کی سنگلاخ زمین جہاں پانی کی ایک ایک بوند کو لوگ قیمتی نعمت سمجھتے ہیں۔ حوضِ کوثر کی بخشائش لطف دے رہی ہے۔

ذلّت وگمنامی حضورؐ کے مخالفین کے حصّہ میں آئی

ابتر: ابتر کٹے ہوئے لنڈے جانور کو کہا جاتا ہے عرب کے محاوروں میں جن کا بیٹا نہ ہو اس کو ابتر کہتے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادوں کی رحلت پر دشمن بغلیں بجاتے اور خوش ہوتے تھے کہ اسلام کا جھگڑا بس محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کے دم تک رہے گا۔ اس کے بعد تو گھر میں چراغ روشن نہیں ہوگا۔ نام تو کیا روشن ہوتا۔ اس کا جواب دیا گیا کہ ابتر تو وہ شخص ہے جو آپ کی عداوت اور دشمنی میں اندھا ہوگیا ہو۔ آپ پر عیب لگاتا ہو، آپ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو آپ کی اہانت کرتا پھرتا ہو، آپ پر طرح طرح کی باتیں کرکے اپنے دل کا بخار نکالتا ہو۔ آپ کی ان گنت روحانی اولاد جو ساری دُنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور آپ کا دین اور اس کے آثار و انوار جو عالم میں چمک رہے ہیں اور آپ کی وہ یاد جو نیک نامی اور محبت وعقیدت کے ساتھ ارب ہا ارب انسانوں کے دلوں کو گداز رہی ہے، دوست و دشمن سب آپ کا لوہا مان رہے ہیں، پھر آخرت کی ان گنت نعمتوں میں حوض کوثر اور شفاعت کبریٰ، مقام محمود جیسے بیش بہا اعزازات اور مقبولیتِ عامہ جو علی رؤس الاشہاد حاصل ہوگئی ہے۔ جب ان پر نظر کی جائے تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ابتر تو حقیقت میں وہ ہے جو آپ کو ابتر کہتے تھے۔ اور یہ محض جوابی جملہ نہ سمجھا جائے بلکہ قرآنِ کریم کی یہ اہم پیش گوئی

حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیش گوئی کی گئی تھی اس وقت تو لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہی ابتر سمجھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے اور کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ قریش کے بڑے بڑے سردار ابتر ہو جائیں گے۔ جو صرف مکہ میں نہیں بلکہ سارے عرب پر چھائے ہوئے تھے۔ اولاد اور کنبہ جتھ کے ساتھ مال و دولت بھی رکھتے تھے۔ حج کے انتظام اور حجاج کی خدمات کی وجہ سے بڑے نامور تھے اور تمام قبائلِ عرب سے وسیع تعلقات رکھتے تھے۔

چند سال میں عرب کی کایا پلٹ گئی

لیکن چند ہی سال میں عرب کی ایسی کایا پلٹ گئی کہ ایک وقت وہ تھا کہ سنہ ۵ھ میں غزوۂ احزاب کے موقعہ پر قریش بہت سے قبائل عرب و یہود کو لے کر جب مدینہ پر چڑھے ہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو محصور کر کے شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی یا تین سال بعد یعنی سنہ ۸ھ میں پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر چڑھائی کر دی تو کفار قریش کا کوئی حامی مددگار نہ تھا اور انھیں نہایت بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ یہاں تک کہ مکہ معظمہ بغیر لڑائی کے فتح ہو گیا۔ کوئی ادنیٰ مزاحمت بھی نہیں ہوئی۔ پھر اس کے ایک سال کے اندر اندر پورا ملک عرب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مٹھی میں تھا۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے قبائل کے وفود آ کر بیعت کر رہے تھے اور آپ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے۔ اور ایسے بے نام و نشان ہو گئے کہ اُن کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل، ابولہب یا عاص بن وائل یا عقبہ بن ابی معیط وغیرہ دشمنانِ اسلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور وہ جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔

اس کے برعکس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آل پر دُنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ اور اربوں انسانوں کو آپ ہی سے نسبت پر فخر ہی نہیں بلکہ آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک انتساب سے عزّت و شرف ہے۔ کوئی سیّد ہے تو کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے تو کوئی صدیقی ہے تو کوئی فاروقی ہے تو کوئی عثمانی ہے، کوئی زبیری ہے تو کوئی انصاری ہے۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ بلکہ آپ کی نسبت سے شہرت ان دشمنوں کو بھی مل گئی۔ لیکن نسبت چوں کہ مقابلہ کی تھی اس لیے شہرت بھی نفرت و حقارت کے ساتھ نصیب ہوئی۔ حتّیٰ کہ ابوجہل و ابولہب اور نفرت و حقارت دونوں لازم و ملزوم ہو گئے۔ قرآنِ کریم کی شہادت نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضور صلے اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔

اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ ہم کو اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کرنے کی نیک توفیق و ہدایت دے اور آخرت میں آپ کے دستِ مبارک سے کوثر کا جام نوش کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

بجاہ سیّد المرسلین صلے اللہ علیہ وسلّم۔

جنّات کا قبول اسلام

مولوی عبدالسبحان لطیفی (دگرور ضلع کرنول) مدرس دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور

اللہ تعالےٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق جن بھی ہے جو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ جنّات کو اللہ تعالےٰ نے انسان سے پہلے آگ سے پیدا کیا۔

سورۂ حجر میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُوْمِ

ترجمہ: ہم نے انسان کو کھنکھناتی ہوی مٹی سے جو سڑے ہوے گارے سے بنی تھی پیدا کیا ہو ل جنّات کو اس سے پہلے لُو کی آگ سے پیدا کیا۔

اسلام سے پہلے عرب میں جنّات کی پوجا کی جاتی تھی۔ ان سے مدد مانگی جاتی تھی۔ بت خانوں کے پجاری اور کاہنوں سے ان کی دوستی تھی اور وہ اُن کو غیب کی خبریں بتایا کرتے تھے۔ یہ بھی خیال تھا کہ وہ صورتیں بدل کر لوگوں میں پھرتے ہیں اور اُن کو ستاتے ہیں۔ وہ جنگلوں میں انسانوں کو مار ڈالتے تھے۔ راستوں سے اٹھالے جاتے تھے۔ لوگوں کو بیمار کر ڈالتے تھے۔ ان کے ہوش وحواس خراب کر دیتے تھے۔ غرض جس طرح خدا کی خدائی میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیویاں شامل تھیں اسی طرح جنّات بھی شریک تھے۔

سورۂ انعام میں ہے: وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ: اوران مشرکین نے جِنّات کو خدا کا شریک بنالیا۔ سورۂ صافات میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا: ان مشرکین نے اللہ تعالےٰ اور جنّات کے درمیان رشتے قائم کرلیے۔

اسلام نے ان اعتقاداتِ باطلہ کو مٹایا۔ اس نے بتادیا کہ صرف ایک ہی قوت ہے جو سب چیزوں میں متصرف ہے اور وہ اللہ تعالےٰ ہے۔ اور یہ بھی تبلادیا کہ جنّات بھی اس کے حضور میں ویسے ہی عاجز ہیں جیسے انسان۔ جنّات میں مومن بھی ہیں۔ کافر بھی ہے اور وہ بھی اللہ تعالےٰ کی وحدانیت اور اس کے احکام ماننے کے لیے ویسے ہی مکلف ہیں جیسے انسان۔

سورۂ ذاریات میں ہے : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۔ اور ہم نے جنّات اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف ہماری عبادت کریں ۔ سورۂ انعام میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اے جنّات اور انسانوں کی آبادیوں کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے اور وہ تمہیں میری آیتیں پڑھ کر نہیں سناتے تھے ۔ اور اس دن کے آنے سے تمہیں نہیں ڈراتے تھے ۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے جنّات اور شیاطین آسمان کے قریب پہنچ جاتے تھے ۔ فرشتوں کی باتیں سنتے تھے ۔ کاہنوں نے اپنی طرف سے اس میں کچھ اور اضافہ کرکے بیان کردیتے تھے اور اس سے انھیں فائدہ پہنچتا تھا ۔ جب حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قریب آیا تو یہ جنّات اور شیاطین آسمان کی طرف اوپر چڑھنے سے روک دیے گئے اور شہابِ ثاقب والے ستاروں سے مارے جانے لگے ۔ کاہنوں اور عاملوں کی خبررسانی کے ذرائع بند ہوگئے تو جنّات کو فکر ہوی اور سوچنے لگے اب کوئی انقلاب عظیم ہونے والا ہے ۔ تفتیش حال کے لیے غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ نبیٔ آخرالزماں صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگئی ہے ۔ اس لیے اب جنّات اور شیاطین کا آسمان تک جانا بند کردیا گیا اور ان کی روک کے لیے شہاب ثاقب کی شکل میں آگ کے شعلے بکھرا دیے گئے ہیں اور جب یہ آسمان کی طرف جانے کا ارادہ کرتے تھے تو وہ شعلوں سے مارے جاتے تھے ۔

اللہ تعالیٰ سورۂ حجر میں فرمایا ہے : وَجَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ اور ہم نے آسمانوں میں برج بنائے ہیں ان ستاروں کو دیکھنے والوں کے لیے زینت اور آرائش بنایا اور ہر راندۂ درگاہ شیطان سے اس کو محفوظ رکھا ہے ۔ لیکن اتنا ہے کہ وہ چوری سے کچھ سننا چاہے تو ایک چمکتا ہوا ستارہ اس اس کا پیچھا کرتا ہے ۔

تاہم جنّات اس تلاش میں رہے کہ نبیٔ آخرالزماں صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہاں ہیں؟ کئی سال کے بعد ایک دن مقام نخلہ میں صبح کے وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے ۔ نماز میں قرآنِ مجید کی آیتیں تلاوت فرما رہے تھے کہ جنّات کی ایک جماعت آی ۔ اس جماعت نے جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو پکار اٹھی کہ یہی وہ نورِ حق ہے جو چمکتے ہوے ستاروں میں ہمیں نظر آتا ہے ۔ اور وہ لوٹ کر اپنی قوم میں چلے گئے اور قوم کو خاتم النبیین کی بعثت کی بشارت دی ۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر دی ۔ سورۂ جنّ میں یہ قصّہ مذکور ہے ۔

اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دیجیے کہ مجھے بذریعہ وحی خبر دی گئی ہے ۔ جنّات کی ایک جماعت نے قرآنِ حکیم سنا تو انھوں نے کہا ہم نے عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف رہ نمائی کرتا ہے ۔ اس لیے ہم اسی پر ایمان لائے اور

اب ہم ہرگز اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے اور ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے۔ اس نے اپنے لیے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ کسی کو اولاد بنایا ہے اور ہم میں جو احمق ہوتے ہیں وہ اللہ تعالےٰ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے اور ہمارا یہ خیال تھا کہ جنّات کبھی اللہ کی شان میں جھوٹ بات نہیں کہیں گے اور بہت سے لوگ آدمیوں میں ایسے تھے کہ وہ جنّات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ ان آدمیوں نے اُن جنّات کی بد دماغی اور بڑھادی جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا۔ ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال رکھا تھا کہ اللہ تعالےٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا۔ اور ہم نے آسمان کی تلاشی لینی چاہی تو ہم نے اس کو سخت پہرہ اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا اور ہم آسمان کے موقعوں میں سننے کے لیے جا بیٹھا کرتے تھے۔ تو اب جو کوئی سننا چاہتا ہے وہ اپنے لیے ایک شعلہ تیار کرتا ہے اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے۔ یا اُن کے رب نے انھیں ہدایت دینے کا قصد فرمایا ہے اور ہم میں بعض نیک ہیں اور بعض اور طرح کے ہیں۔ ہم مختلف طریقوں پر تھے اور ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین میں اللہ تعالےٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں۔ اور ہم نے جب ہدایت کی بات سُن لی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو شخص اپنے رب پر ایمان لائے گا اسے نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا خوف ہوگا۔ اور ہم میں بعض مسلمان ہیں اور بعض ہم میں سے بے راہ ہیں۔ جو مسلمان ہو گیا تو اس نے بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا اور جو بے راہ ہے وہ دوزخ کے ایندھن ہیں۔

ایک موقع پر جنّات حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ پہنچے اور آپ کو اپنے ہاں لے گئے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

ایک دفعہ رات کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم لوگوں نے نہ پایا۔ میدانوں میں گھاٹیوں میں سب جگہ تلاش کیا مگر آپ نہ ملے صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ غارِ حرا کی طرف سے تشریف لا رہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمیں بہت بے قراری رہی کہ آپ کہاں تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: رات جنّات کا قاصد آیا تھا اور میں اُسی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں نے انھیں قرآن مجید پڑھ کر سنایا۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے جنّات کی ایک اور ملاقات کا واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان فرمایا ہے: حضور صلے اللہ علیہ وسلم مجھے ساتھ لے کر مکہ معظمہ سے آگے تشریف لے گئے۔ وہاں مجھے ایک جگہ بہت سی پرچھائیاں نظر آئیں جو آپ کی طرف چلیں اور پھر آپ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ پھر آپ دیر تک ان کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ فجر کی نماز کا وقت آیا تو آپ نے وضو کا پانی طلب فرمایا، وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تو دو اجنبی آدمی آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! اجازت ہو تو ہم بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھیں اور پھر وہ بھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے نماز میں ساتھ کھڑے ہو گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد میں نے آپ سے دریافت فرمایا رسول اللہ! یہ کون تھے؟ حضور نے ارشاد فرمایا: یہ جنّات تھے۔ اپنے کچھ معاملات میرے پاس فیصلہ کے لیے لائے تھے۔

(بقیہ مضمون ص157 پر)



المدارس العربية وقضايا العصر الحاضر

دكتور بيش امام نثار احمد : رئيس القسم العربي والفارسي والاردو - جامعة مدراس

بدا يزدهر الإسلام فى الهند منذ فجر النبوية المحمدية ومن المعروف ان العرب كانوا يزورون سواحل غرب الهند لاغراض تجارية قبل إزدهار الإسلام وهولاء ابناء العرب استوطنوا الهند وتزوجوا النبوة الهنديات واحتكاك العرب هذا بالهند فى القرون الاولى كون الجو العربي فى هذه الأماكن وزين الإسلام هذه الصلات بين العرب وابناء الهند وكذا ازدهرت الأمة الإسلامية فى بلاد الهند وابناء الإسلام بدأ يبنون المساجد وكذلك أسرا المدارس لتدريس اللغة العربية والقرآن الكريم وهكذا دخل الإسلام فى جنوب الهند واما فى الهند الشمالى ولاسيما فى المناطق الشمالية جاؤوا إليها ابناء العرب فى العصر الأموى وأقاموا الحكومة الإسلامية فيها وقصة قدوم محمد بن قاسم معروف بين اوساط الناس فى هذه المناطق، ثم دخل الملوك والعلماء من بلاد الفارس وتركستان وغزنة وبخارا وخيواة و تاشقند وخوارزم وشيروان وغيرها - لتبليغ رسالة الإسلام فى الهند وغيرت الهند من قدوم هولاء الناس وازدهرت الثورة الإسلامية العظمى فى بلاد الهند من شمالها الى جنوبها ومن شرقها إلى غربها ودخلوا فى دين الله الافواج من ابناء الهند ويشير إلى هذه الثورة فى الهند بندت نهرو رئيس الوزراء الأول بعد استقلال الهند قائلا : إن دخول الغزاة الذين جاؤوا من شمال الهند ودخول الإسلام فى الهند لهما أهمية كبرى فى تاريخ الهند بانه قد نضح الفساد الذى كان قد انتشر فى المجتمع الهندوكي انه قد اظهر القسام الطبقات على أساس الدين واللسان والجنسية وغير ذلك من اللمس والمنبوذية وحب الاعتزال عن العالم الذى كانت تعيش فى الهند ان النظرية الأخوة الإسلامية والمساوات التي كان المسلمون يومنون بها ويعيشون فيها أثرت فى أذهان الهندوس تأثيرا عميقا.

وكان اكثرخضوعا۔ هٰذا التأثير الرؤساء الذين حرم عليهم المجتمع الهندى المساواة والتمتع بالحقوق الاساسية (من رسالة دكتوراة للاستاذ محمد سليمان وموضوعها: الدراسات العربية والمراكز الإسلامية فى تامل نادو۔)

حكم المسلمون الهند لثمانية قرون أو أكثر منها فى العصور هذه اقام المسلمون المدارس العربية فى انحاء الهند وازدهرت جماعة العلماء الكبار وعلى رأسهم حضرة الشيخ العلامة الشاه ولى الله الدهلوى الذي الف امهات الكتب الإسلامية ومنها حجة الله البالغة وهذا الكتاب بين اوساط علماء الإسلام فى العالم كله وكذلك ابناء اسرته الشيخ عبد الحق محدث دهلوى وغيره استمروا الجهاد العلمى فى ديار الهند بمؤلفاته الدينية والعلمية وكذلك علماء الإسلام من المناطق الأخرى مثل صادق آباد (بتنه اليوم) فى ولاية بهار وعلماء لكهنؤ وشاه جهان بور فى ولاية أتر برديش وكذالك علماء جنوب الهند ولاسيما علماء اسرة الشيخ شرف الملك بهادر ساهموا فى تثقيف ابناء المسلمين فى عصورهم الف الشيخ شرف الملك بعاد الكتب الدينية باللغة العربية ومنها "نثر المرجان فى نظم القرآن" معروف جدا وهذا الكتاب يشتمل على سبعة اجزاء وكذلك ابناء واحفاده ايضاً ألفوا الكتب العديدة و منها شرح المؤطأ للامام مالك رح مشهور بين علماء الحديث ومؤلف هذا الكتاب هو الشيخ القاضى بدر الدولة الذى كان ناظم المدرسة اعظم بمدراس وهكذا كانت الهند تجرى على الطريق الإسلامى وعلماء بها كانوا يخدمون ابناء الأمة فى مجال الدين والتربية ولكن غيرت سياسة الهند وضعفت الحكومة الإسلامية فى الهند لاسباب عديدة ومنها قدوم الانجليزيين إلى الهند وفسادهم و مزامراتهم ضد المسلمين مهدت الطريق لزوال حكومة المسلمين فى الهند وبعد ثورة الف وثمانية وسبعة وخمسين (١٨٥٧ء) اصبح المسلمون مغلوبين فى الهند وغابت قوة المسلمين من ارض ارض الهند كما تغيب السحاب من السماء بعد المطر ولكن بماء المطر ينبت الارض الأشجار ذات اوراق وازهار عديدة ومرة أخرى تزدهر الحدايق والحقول وكذلك فى نفس الطريق ازدهرت فئة علماء الإسلام والمفكرون فى الهند وهؤلاء العلماء بخواطرهم العلمية والدينية بدأ يحسون ان للوعى الإسلامى فى الهند لابد للمسلمين فى الهند ان يجتمعوا قواتهم الباقية لتكوين المجتمع الإسلامى بقيام المدارس العربية والمعاهد الإسلامية وبإذن الله تعالى عزوجل أقام علماء الهند المدارس الكبرى فى الهند بعد ثورة ١٨٥٧ء والمعروفة منها دار العلوم بديوبند أسسها الشيخ محمد قاسم نانوتوى رح سنة ١٢٨٣ھ وقبل تاسيس هٰذه المدرسة أسس الحاكم المسلم فى حيدر آباد الجامعة النظامية وكذلك فى جنوب الهند

أقام علماء اسرة قطب ويلور مدرسة لطيفية ببلده ويلور وكذلك الشيخ عبدالوهاب أقام مدرسة ياقيات صالحات ببلدة ويلور نفسها سنة ١٣٠٨هـ وفى نفس الطريق أسس علامة شبلى نعمانى دار العلوم ندوة العلماء ببلدة لكهنؤ بمنهج جديد بنية الاصلاح والتطور فى الدراسات الدينية وفى جنوب الهند كما ذكرت قبل هذا أقام علماء المسلمين والرجال الاغنياء من المسلمين المدارس العربية العديدة ومنها جامعة دار السلام معروفة فى الهند وفى خارجها ولاسيما فى العالم العربي لنشاطاتها العديدة و نجد فيها دارسات تكنولجيا ودراسات كمبيوتر ايضاً وهذه خطوة مثبة جدا فى تاريخ المدارس العربية فى الهند

وعلماء هذه المدارس قاموا بخدمات جليلة فى تبليغ رسالة الإسلام إلى كافة الناس والالاف من ابناء المسلمين تعلموا اللغة العربية وآدابها وتأهلوا فى علوم دينية عديدة مثل علوم التفسير والحديث والفقه وكذالك قام علماء هذه المدارس وعلى رأسها دار العلوم ديوبند بخدمات جليلة فى كل مجال حياة المسلمين وسدوا ابواب الفتن ومؤمرات وحركات ضالة مثل حركة قاديانية وحركة بهائية وكذا كافحوا وصارعوا وجاهدوا ضد الانجليز وفسادهم ومهدوا الطريق لاستقلال الهند.

المسلمون فى الهند بعد الاستقلال

الهند اليوم هى بلد متطور وأهلها متأهلون فى العلوم الشتى وماهرون فى الفنون العديدة ويستطيع أهل الهند اليوم صناعة الصواريخ والطيارات والدبابات وغيرها و نجد فى الهند اليوم مأت من الجامعات العصرية ومعاهد العلمية الجديدة حيثما يدرسون ملائيين من الطلاب والطالبات العلوم الراقية والخريجيون من هذه الجامعات والمعاهد يعملون فى الحقول الشتى فى الهند والبلاد الاجنبية المتطورة العديدة بحيث العلماء الماهرين والاطباء والمهندسين و المعلمين وغيرهم ولهم مكان مرموق فى المجتمع العالمى وكذلك نجد فى الهند الحركات الهدامة التى تعمل وتسعى للفساد والغارة على المسلمين وهدفها عداوة الإسلام والمسلمين وعندهم وسائل الاعلام وسلاح الصحافة فى كل لغات الهند وهم يسعون ليلا ونهارا التهديم صناديد أهل الإسلام والعدد القليل من ابناء المسلمين يدرسون فى الجامعات العصرية وهم لايعرفون مسائل الامة وكذلك طلاب المدارس العربية لايعرفون عن الحركات والثورات العلمية والاجتماعية الجديده التى تجري فى الهند اليوم ولذا لابدلنا أن نخطط المناهج الجديدة فى دراسات المدارس العربية

لکی طلباء هذه المدارس بعد تکمیل دراساتهم یؤدوا واجباتهم الدینیة وکذلك یکسبوا رزقا ذات کرامة ویعیشوا فی المجتمع بحیث رجال العزة والکرامة۔

لتغییر المناهج فی الدراسات علی قادة العلماء ان یفکروا علی الخطوط الجدیدة وعلی سبیل المثال مع الدراسات مثل التفسیر والحدیث والفقه وغیرها تدرس الموضاعات التالیة ایضاً علی مستوی دبلوما و بعضها اجباریا بعضها اختیاریا وتکون نافعا ومنها۔

۱۔ دبلوما فی الصحافة ووسائل الاعلام۔
۲۔ دبلوما فی دراسات کمبیوتر العلیاء۔
۳۔ دبلوما فی تربیة صناعیة۔
۴۔ دبلوما فی علوم الاقتصاد والمعیشة۔
۵۔ دبلوما فی تبربیة الریاضیات۔
۶۔ دبلوما فی الطب الیونانی۔
۷۔ دبلوما فی تربیت خدمات اجتماعیة
۸۔ دبلوما فی مهنة کهربائیة۔
۸۔ دبلوما فی تربیة خدمات فی المستشفی۔
۹۔ دبلوما فی ترسب خدمات فی القری فی الحقل الزراعی

وهکذا طلاب المدارس العربیة یمکن لهم ان یعملوا فی میادین متعددة بحیث الماهرین فی الحقول العدیدة مثل الطب والتجارة والزراعة والهندسة والخدمات فی القری وبحیث ماهری الکمبیوتر وغیرها۔ ولا بأس بهذه الأعمال ولو أنهم علماء الدین وعندنا مثال جامع الازهر الذی له عمر الف سنة و فی بدایة قیامه کانت فی صحنة الصفوف لدراسة اللغة العربیة ونحوها وصرفها وبعض الکتب القدیمة فقط وبعد ذلك بتجربة القرون الآن اصبح الجامع الازهر جامعا عصریا ویبقی روحه الأصیل فی حرمه وکذلك لابد لعلماء الهند وزعماء المدارس العربیة فی الهند ان ینقلبوا افکرهم ویختاروا المناهج والدراسات الجدیدة کما هی فی الجامع الأزهر الشریف۔

مدارسِ عربیہ اور عصری تقاضے

عربی مضمون کا خلاصہ

پیش امام نثار احمد۔ صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو۔ مدراس یونی ورسٹی۔ چنئی۔

ہند و عرب کے تعلقات شرقِ اوسط اور برصغیر ہند کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی عربوں کی ہند میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اور ازدواجی تعلقات بھی دونوں قوموں کے درمیان قائم تھے۔ مغربی سواحل کے بعض علاقوں مثلاً گجرات، مہاراشٹر، کونکن اور کیرالہ کے مختلف مقامات میں عربوں کی بستیاں بھی آباد تھیں۔ پھر اسلام کے ظہور نے ان روابط کو استحکام

بخشا۔ اسلام کے عقیدۂ توحید نے اہلِ ہند کے فکری دھاروں کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور ہندوستانی قوم پہلی بار "عظمتِ انسان" سے روشناس ہوئی۔ چھوت چھات، ذات پات کی بنیاد پر ان کے اندر جو رسہ کشی چل رہی تھی وہ ایک حد تک ختم ہوئی۔ اور سینکڑوں کی تعداد میں ہندوستان کے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ صوفیائ، علماء اور دیگر مبلغین نے ہندوستان کو اسلامی اقدار سے مزیّن کیا۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی حکومتیں بھی قائم ہونے لگیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانہ میں محمد بن قاسم نے سندھ میں پہلی بار حکومت قائم کی۔ تبلیغ اسلام اور قیام حکومت کا سلسلہ چلتا رہا۔ پھر مختلف سیاسی وسماجی اسباب کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومت کمزور ہوتی ہوگئی۔ اورنگزیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد عملاً مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ کچھ نواب رہ گئے جن کو اسلام کی تبلیغ یا اصلاحِ امّت کا خیال نہ رہا۔ شاہ ولی اللہ الدھلوی اور ان کے مبارک خاندان کے علماء اپنی تصانیف اور وعظ وارشاد کے ذریعہ مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ اسی زمانہ میں دہلی میں مدرسۂ رحیمیہ قائم ہوا۔ جہاں کے فارغ علماء نے مسلمانوں کو بدعات وخرافات اور ارتداد سے بچانے کے لیے مجاہدانہ کارنامے انجام دیے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مسلمان سیاسی لحاظ سے بہت کمزور ہوگئے۔ پھر علماء نے اپنی کمر باندھی اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور مسلمانوں کی قیادت اپنے ذمّہ لے کر آگے بڑھنے لگے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ مولانا محمد علی مونگیری نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تاسیس رکھی۔ سہارنپور میں مدرسۂ مظاہر العلوم قائم ہوا۔ جنوب میں دارالعلوم لطیفیہ قائم کیا گیا اور پھر مدرسۂ باقیاتِ صالحات قائم ہوا۔ یہ دونوں مدرسے دارالسرور ویلور میں علماء ربّانی نے قائم کئے۔ دونوں کا منبعِ روحانی ایک ہی ہے یعنی "مکانِ حضرت قطبِ ویلورؒ" اور وہاں کے علمائے کرام کی کراماتِ علمیہ وروحانیہ نے اس علاقہ کے مسلمانوں کی دینی قیادت وامارت کا عظیم فریضہ انجام دیا جس کے اثرات آج بھی اس علاقہ کے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی زوال کے پیشِ نظر بعض عمائدین قوم نے انگریزی تعلیم کی طرف قوم کو متوجہ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ دہلی کا قیام عمل میں آیا اور سینکڑوں ہائی اسکولس اور کالج وغیرہ قائم ہوئے پھر ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔ اور پھر ایک بار ہندوستان کے مسلمان مختلف قسم کے بحرانوں سے دوچار ہوئے۔ مختلف قیادتوں نے امت کو مختلف راستوں پر لا چھوڑا۔ منزل سے قریب ہونے کی بجائے امّتِ مسلمہ اپنے نصب العین اور منزلِ حقیقی سے دور ہوتی جارہی ہے بلکہ وہ مضطرب اور پریشان بھی ہے۔ اس صورتِ حال سے امّت کو نکال کر صحیح رہنمائی کا کام صرف علماء ہی انجام دے سکتے ہیں جو مدارسِ عربیہ کے زیرِ سایہ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور ان طلبائے مدارس کے لیے جنھیں امّت کی قیادت کا فریضہ کما حقّہٗ انجام دینا ہے۔ مدارس کا موجودہ نصاب اور تدریسی نظام کافی نہیں ہے۔ لہٰذا اس نصاب کو موجودہ حالات کے تقاضوں کے عین مطابق بنایا جائے۔ جس طرح جامعہ ازہر مصر کو ہزار سالہ مدت کے بعد موجودہ حالات کے مطابق از سرِ نو منظم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی اصلی روح کو پامال ہونے نہیں دیا۔ یعنی علوم عربیہ واسلامیہ کو مکمل طور پر باقی رکھ کر کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مثلاً عربی کے علاوہ دیگر زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں کمپیوٹر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ طبّی تعلیم کا شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے اور صنعتی تعلیم کے لیے مختلف شعبہ جات کا قیام بھی عمل میں آیا ہے مثلاً علماء اگر INTERNET کی کارکردگی سے واقف ہوں تو یہود ونصاریٰ اور دیگر اسلام دشمن لوگوں اور فرقوں اور اسلام دشمن

(بقیہ صـ ۱۴۴ پر ملاحظہ ہو)



اردو نعتیہ شاعری میں شعراء سے لغزشوں کے بعض وجوہ

ڈاکٹر سید وحید اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھوی

ہم نے پچھلے مضمون میں دو اشعار پیش کرکے اوران کا تجزیہ کرکے یہ دکھایا ہے کہ نعت کے موضوع پر شعراء کیوں کر اور کس طرح غلطیاں کرتے ہیں۔ اردو زبان میں شعر کہنے والے اتنے کثرت سے ہیں جن کا شمار کرنا بھی عملاً ممکن نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر وہ آدمی جس کی طبیعت کچھ موزوں ہے، وہ اپنے کو شاعر سمجھتا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ موزونیٔ طبع بھی شعر کہنے کے لیے لازمی شرط نہیں رہ گئی تو اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا تھا کہ کلام کو سمجھنے کے لیے معنی و بیان کے مسائل سے واقفیت ضروری ہے۔ مگر اب اس کے بغیر بھی شاعر کیا بلکہ لوگ مفسّر اور علامہ بن گئے ہیں۔ معنی و بیان کے مسائل سے واقفیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ صرف ان کی اصطلاحات اور ان تعریفوں کا حافظ بن جائے۔ بغیر ذوق کے محض ان اصطلاحات کو جان لینا کافی نہیں۔

چوں کہ نعتیہ اشعار عام طور سے عوام میں پڑھے جاتے ہیں اور انھیں سے داد وتحسین حاصل کی جاتی ہے اس لیے نعتیہ شاعری کرنے والے لوگ اور بھی زیادہ نظر آتے ہیں۔ انھیں یہ احساس نہیں کہ موضوع کے اعتبار سے یہ مشکل ترین شاعری ہے۔ جب اس شاعری کے لیے کوئی شرط نہ رہی تو لازمی طور پر ایسے شاعروں سے لغزشوں کا ہونا ممکن ہی نہیں ضروری ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں عام شعراء سے غلطیاں کیوں ہوتی ہیں؟

شاعری میں زبان وبیان کے پہلوؤں پر نظر رکھنا اور درست شعر کہنا ضروری ہے لیکن شعر کو محاسن کا حامل بنانے کے لیے محض اتنا کافی نہیں ہے۔ نعتیہ شاعری میں اگر شاعر عشقِ رسول میں ڈوبا ہوا ہو تو اس کے کلام میں جو قوت و تاثیر اور جذبہ کی صداقت نمایاں ہوگی وہ محض بیانیہ شاعری میں ممکن نہیں۔ عشق کی کیفیت اس کو لغزشوں سے بھی محفوظ رکھ سکتی ہے۔ کیوں کہ یہاں عشق خود معلّم ادب ہوگا اور یہ عشق اس بارگاہ کی عظمت کو فراموش نہ ہونے دے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاعر میں یہ کیفیت ہر وقت ہو۔ اس لیے نعت لکھنے میں ہر وقت اپنے حدود کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

عرفی جس کے ذہن کی درّاکی اور علوِّ فکر اس کے کلام سے اظہر من الشمس ہے اور جس کو بڑے بڑے باذوق

دانشوروں نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اپنے ایک نعتیہ قصیدے میں لکھتا ہے کہ نعت گوئی میں صرف ذہنی کاوش سے کام لینا نعت کے مرتبہ کے سزاوار نہیں ہے۔ بلکہ یہاں اخلاص و محبت کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتا ہے:

زیں جاست کہ اندیشہ نگوں کرد علم را　　　دانش نکشاید بسزا عقد نعتست

یعنی صرف علم و دانش سے نعت کا عقدہ نہیں کھل پاتا۔ یہاں فکر عاجز ہے اور عجز سے اپنے جھنڈے کو جھکا دیا ہے۔

از بتکدہ چون آورم آہوئے حرم را　　　مدحِ تو ز اخلاص کنم گر بہ نہ از علم

میں آپ کی مدح علم سے نہیں بلکہ اخلاص و محبت سے طلب کرتا ہوں (عقل کے) بتکدہ میں حرم کا آہو کیسے پا سکتا ہوں (یعنی میری خواہش ہے کہ آپ کے عشق میں ڈوب کر نعت لکھوں نہ کہ ذہنی کاوش سے۔)

ہر آدمی سے غلطی ممکن ہے۔ سوا اُس کے جس پر وحی کا نزول ہوتا ہے یا جسے خُدا ہی محفوظ رکھے اور شعراء اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن نعت لکھنے میں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ ہر آدمی کے علمی اور فکری حدود بھی ہیں جس شاعری کا تعلق مشاہدۂ کائنات اور اس میں فطرت کے عوامل سے ہو، اس میں آدمی جزئیات کے بیان میں فکری غلطیاں کر سکتا ہے۔ پھر اس کا شعور مزید بیدار ہوتا ہے اور اس کی استنباطی اور استخراجی قوت اس پر نئے اسرار منکشف کرتی ہے۔ اس طرح اس کی فکر ارتقائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ اس عمل میں اُس سے جو غلطیاں اور فروگزاشتیں ہوی ہوں، اُن پر گرفت تو کی جا سکتی ہے لیکن اسے معتوب نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ غلطیاں خطائے بشری کا تقاضا ہیں اور مفکر سے بالعموم ایسا ہونا ضروری ہے۔ شاعر یا مفکّر سے غلطیاں کیوں ہوتی ہیں، یہ میرا موضوع نہیں ہے۔ یہ درمیان میں صرف سخن گسترانہ بات آگئی ہے۔ مقصد صرف اتنا کہنا ہے کہ الانسان مرکبٌ من الخطاءِ والنسیان۔

لیکن نعت لکھتے وقت ہر فرد کو اپنی حدود کا خود احساس کر لینا چاہیے۔ اگر ہر شاعر اس بات کا لحاظ رکھے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرے تو اس محتاط رویّہ کی بناء پر نعت لکھنے میں یقیناً اس سے غلطیوں کا امکان کم سے کم ہو جائے گا، اور کم از کم وہ معنوی غلطیوں سے تو بچ سکے گا۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ زیادہ تر عام شعراء اس کی پروا نہیں کرتے اور غلطیوں کا ارتکاب محض بے پروائی کی بناء پر کر جاتے ہیں۔

ہماری زبان میں بعض الفاظ روزمرّہ اور محاورات ایسے ہیں جو عام بول چال بلکہ تحریر و تقریر میں بھی استعمال ہوتے ہیں لیکن وہی الفاظ و محاورات رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان کے منافی ہیں یا طریقۂ استعمال سے آپ کی شان کے منافی ہو سکتے ہیں میں یہاں ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔ جسے پڑھے لکھے لوگوں کی زبانی محفلوں میں مجھے بار بار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

ستارہ لاکھ چمکے مہرِ انور ہو نہیں سکتا　　　مثالِ مصطفےٰ کوئی پیمبر ہو نہیں سکتا

اس شعر پر غور کرنے کے لیے تمہید میں ایک مقدمہ ضروری ہے۔ اردو شاعری میں رشک کا مضمون کثرت سے

سے استعمال ہوا ہے۔ رشک کو اچھا سمجھا گیا ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص خواہش کرے کہ غالب کی طرح بڑا شاعر بن جائے یا کسی کسی عالمِ دین کی طرح بڑا عالم بن جائے یا گاما پہلوان کی طرح پہلوان بن جائے تو یہ خواہش بُری نہیں ہے۔ البتہ حسد بُری چیز ہے۔ کیوں کہ اس میں آدمی دوسروں کی تباہی و بربادی کی خواہش کرتا ہے۔ لیکن اگر آدمی رشک نہ بھی کرے تو یہ ہر آدمی کا حق ہے کہ قدرت نے اس کو جو اچھی صلاحیتیں دی ہیں ان کو استعمال کر کے اپنی استعداد کو ممکنہ حد تک کمال تک پہنچائے۔ اب اگر ایک آدمی اپنی جسمانی قوت کی استعداد کو اس لیے بڑھاتا ہے کہ یہ اس کا حق ہے تو وہ اپنی جسمانی قوت کو بڑھائے۔ یہ رشک نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنا مطمحِ نظر یہ بنائے کہ وہ گاما کی طرح پہلوان بن جائے تو یہ رشک ہوگا۔ اس طرح اگر وہ علمِ دین حاصل کرتا ہے اور اپنی علمی صلاحیت کو بقدرِ استطاعت درجۂ کمال تک پہنچائے تو یہ خوبی کی بات ہوگی لیکن اسے رشک نہ کہیں گے لیکن اگر وہ یہ خواہش کرے کہ وہ مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی جیسا عالم بن جائے تو یہ رشک ہوگا۔ اور یہ بُری بات نہ ہوگی۔ ہمارے اصل مقصد کو سمجھنے کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں۔ ان مثالوں کے بعد اس مصرعہ پر غور کیجیے:

ع ستارہ لاکھ چمکے مہرِ انور ہو نہیں سکتا

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ مہرِ انور ایک ستارہ ہی ہے بلکہ صرف شاعر کے مدّعا کو پیشِ نظر رکھیں گے جو شعر کے مفہوم سے ظاہر ہے۔ مصرعہ میں روزمرّہ "لاکھ چمکے" استعمال کیا گیا ہے اور پھر "مہرِ انور ہو نہیں سکتا" کہہ کر اسی کے ساتھ "لاکھ چمکے" استعمال کر کے رشک کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ستارہ لاکھ چمکے یا لاکھ چاہے یا لاکھ کوشش کرے۔ اس مصرعہ میں ستارہ اور مہرِ انور کا استعمال بطورِ استعارہ کیا گیا ہے۔ اس میں لفّ و نشرِ غیر مرتّب ہے۔ "مہرِ انور" سے مراد سیدالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات ہے اور ستارہ اُن کے سوا ہر نبی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ ستارہ یعنی ہر نبی اس کوشش میں ہے کہ وہ مہرِ انور یعنی سیدالانبیاء علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرح صاحبِ فضیلت ہو جائے جب کہ یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ یہ تو ملتا ہے کہ بعض نبی نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ کاش وہ آپ صلے اللہ علیہ وسلّم کی امّت میں ہوتے۔ لیکن رشک کا مضمون نبی کے شان کے خلاف ہے۔ اور اگر کوئی اُمّتی ایسا چاہے تو وہ نہ صرف جاہل بلکہ راندۂ درگاہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شاعر نے اسے ناسمجھی سے لکھا ہے۔ اس لیے کوئی فتویٰ نہیں صادر کرنا چاہیے۔ شاعر کی نظر اس پر نہیں تھی کہ اس بیان سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ردیف خود اس کی متقاضی ہے کہ شاعر کو بڑی احتیاط اور بہت سنبھل کر نعت لکھنا چاہیے اور اگر وہ پختہ کار شاعر نہیں ہے تو اس ردیف سے بچنا ہی بہتر ہے۔ بہر حال کھلم کھلا کوئی کلمہ گو ایسا بیان نہ کرے گا۔ اگر جان بوجھ کر کھلم کھلا ایسا بیان کرے تو یقیناً اس پر فتویٰ صادر کیا جا سکتا ہے۔ راقم نے یہ صرف اس لیے لکھ دیا ہے کہ جن نعت گو شعراء تک یہ مضمون پہنچ سکے کم از کم وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو جائیں۔ ان کی احتیاط کا اثر دوسرے شعراء پر بھی پڑ سکتا ہے اور آیندہ ممکن ہے کہ نعتیہ شاعری کے لیے بھی نقد و تبصرہ کے کچھ اصول متعین ہو سکیں۔

عرفیؔ کو نعت لکھنے میں احتیاط کا زیادہ خیال تھا۔ اس کے باوجود لغزش سے خائف رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

ہشیار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے وجم را

اے عرفیؔ ہوشیار کہ ایک ہی آہنگ سے نعتِ شہِ کونین اور دنیا کے بادشاہوں کی مدح نہیں لکھنا چاہیے اور پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے لکھتا ہے:

ہرگاہ کہ در مدح بلغزم تو بخشائے کز مدح تو دانم من حیران شدہ ذم را

اگر میں آپ کی مدح میں لغزش کروں تو مجھے معاف فرمادیں۔ کیوں کہ آپ کے علوِ مرتبہ کا خیال کر کے عقل حیران ہو جاتی ہے۔ اور اس حیرانی میں مجھے معلوم نہیں کہ میں جو مدح لکھتا ہوں وہ آپ کے مرتبہ کے شایانِ شان ہے یا نہیں: اسی لیے غالبؔ نے کہہ دیا کہ:

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

غالبؔ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کو خدا کے سپرد کر دیا کیوں کہ وہی ذاتِ پاک آپؐ کے مرتبہ سے واقف ہے۔

زبان و بیان سے لاعلمی کی بناء پر غلطی کا امکان تو رہتا ہی ہے لیکن اس زمانہ میں جدیدیت کے نام پر زبان میں نہ صرف بناؤ کے مقابلہ میں بگاڑ زیادہ پیدا ہو رہا ہے۔ بلکہ اسے دانستہ نعت پر آزما کر شاعر ایسی فاحش غلطیوں کا مرتکب ہو رہا ہے کہ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ شعر سے مدح کا پہلو نکلتا ہے یا ذم کا۔ اگر نعت سے ہٹ کر کوئی عام موضوع ہوتا تو ہم کوئی تعارض نہ کرتے لیکن نعت میں ایسی فاحش اغلاط کو دیکھ کر جس میں ذم کا پہلو نمایاں ہے خاموش رہنا خود جرم کا مرتکب ہونا ہے۔ اس لیے یہاں ع " ٹوک دو گر غلط کہے کوئی " پر عمل کرنا اپنا فرض بن جاتا ہے۔

یوں تو اس طرح کی غلطی کہیں بھی اور کسی رسالہ میں بھی کی جائے تو جائز نہیں قرار دی جا سکتی لیکن جب ایک مشہور و معروف دینی درس گاہ دارالعلوم لطیفیہ، ویلور جیسے ذی وقار ادارہ کے ترجمان "اللطیف" میں ایسی غلطیاں شائع ہوں تو اُسے آشکار کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ اللطیف کا دینی وقار مجروح نہ ہونے پائے اور خواص کی نظروں سے گرنے نہ پائے اور عوام غلط رہ نمائی سے بچ جائیں۔

ان باتوں کے ساتھ ایک خوش آیند بات یہ ہے کہ شاعر علیم صباؔ نویدی کی کتاب "کتاب سے کتاب شناسی تک" میں برملا اظہار کیا گیا ہے کہ معاصرین شعراء کی غلطیوں اور عیوب پر گرفت کرنا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خود چاہتے ہیں کہ اگر اُن سے اغلاط سرزد ہوں تو فوراً اس پر گرفت کی جائے۔

علیم صباؔ نویدی کی کتاب "کتاب سے کتاب شناسی تک" کا ابتدائیہ "حرفِ اوّلین" کے نام سے ڈاکٹر راحت سلطانہ کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ جنھوں نے علیم صباؔ نویدی کی نعتیہ شاعری پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا ہے۔ جیسا کہ اُن کے بیان سے ظاہر ہے: وہ لکھتی ہیں:

"عام طور پر ہمارے نقادوں میں ایک صفتِ خاص قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ کسی بھی شعری مجموعے یا نثری شہ پارے پر مقدمہ یا تبصرہ کرتے ہوئے ایسے رسمی جملے اور ایسی عام سطحی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ کسی بھی شاعر کا نام کسی بھی تبصرہ یا مقدمہ کی پیشانی پر لکھ دے تو اس سے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوگا۔ شاید نقادوں کا یہ صلح کل کا رویہ ان کی وسعتِ قلبی کی غماز ہے۔ جس کی وجہ سے شاعر وادیب اپنے معائب و محاسن کے فرق سے نہ صرف ناآشنا رہ جاتے ہیں بلکہ اُن کے ذہن سے ایک طرح کی تعلّی اور ایک گونہ جمود راہ پایا جاتا ہے۔ (خط کشیدہ جملہ کے الفاظ اصل متن میں اسی طرح ہیں۔) جو ادب اور ادیب دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ علیم صبا نویدی کے مذکورہ مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہر ایک تحریر کے سیاق و سباق میں جھانکتے ہوئے اس کے پیش منظر و پس منظر کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور بے کام و کاست اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ یہی امتیازی شان ان مشمولات کو افادۂ عام کے لیے شائع کرنے کا سبب بنی ہے۔"

محترمہ کے لکھنے کے مطابق اس تحریر کے "افادۂ عام" کا جو پہلو اس وقت میرے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ چوں کہ خود علیم صبا نویدی معاصرین شعراء اور ادباء کی غلطیوں پر گرفت کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ (اور راقم کی رائے میں بھی یہ درست ہے۔) اس لیے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خود چاہتے ہیں کہ اگر اُن سے اغلاط سرزد ہوں تو فوراً اس پر گرفت کی جائے۔ ان کا یہ رویّہ میری نظر میں قابلِ تحسین بھی ہے۔

اس کے باوجود اگر معاملہ لغت یا کسی خاص مذہبی موضوع کا نہ ہوتا تو ہم نظر انداز کر جاتے۔ البتہ ہمارا طریقہ الگ یوں ہوگا کہ ہم بلا دلیل کسی کو غلط نہ کہیں گے اور جو کچھ لکھیں گے وہ تحلیل و تجزیہ اور دلائل کے ساتھ۔ کیوں کہ زبان و بیان کے اصول ہمارے پابند نہیں بلکہ ہم ان اصولوں کے پابند ہیں۔ لہٰذا ان اصولوں سے بے نیاز ہو کر ہمیں حکم لگانے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

اصل بحث میں آنے سے پہلے ایک اور امر کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ اس دور میں جدیدیت کے علم برداروں میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے نزدیک اس دور کے اردو شعراء کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ اظہار کے نئے اسالیب اختیار کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلوب کی جدّت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اردو تاریخ پر نظر ڈالیے تو قلی قطب شاہ سے لے کر غالب و اقبال تک اسالیب میں بتدریج ترقی یافتہ صورتیں نظر آئیں گی۔ اسالیب کا یہ سفر جاری ہے اور رہے گا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ سفر کسی ادبی تحریک کے بغیر جاری رہا ہے۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ جدیدیت کے نام پر زبان و بیان کے بنیادی اصولوں سے یکسر انحراف کیا جائے۔ اس پر خود ان کی شاعری گواہ ہے۔ میں نے ایک بار، مدراس یونیورسٹی میں جب شمس الرحمٰن فاروقی کو مدعو کیا تھا تو اُن سے کہا تھا۔ کہ جدیدیت سے زبان کو زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے اور شعراء بڑی بے راہ روی اختیار کر رہے ہیں۔ اس کا جواب انھوں

نے یوں دیا تھا کہ کلاسیکی دور کے صرف چند شعراء ہیں جن کو تاریخ ادبِ اردو میں کوئی مقام حاصل ہے اور بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے، جن کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ یہی حال اس دور کے شعراء کا ہوگا۔ وہ لوگ جن کو شعر کہنے کا سلیقہ ہوگا اور جن کو فن پر قدرت ہوگی وہی زندہ رہیں گے۔ باقی اپنی موت مرجائیں گے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے ماضی کے تجربہ سے مستقبل کی نشاندہی کردی ہے۔ اس آئینے میں شعراء اپنا محاسبہ خود کرسکتے ہیں۔ یہاں ایک بات کا اور اضافہ کرنا چاہوں گا۔ اگر کسی شاعر کی اپنی کوئی فکر ہے اور اس کی قوتِ مشاہدہ تیز ہے اور اس تازہ فکر و تجربہ کو شعری پیکر عطا کرنا چاہتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ کلاسیکی پختگی کو چھوڑ کر اظہار کے صرف نئے طریقہ پر زور دے۔ اس ارادی عمل میں یہ زیادہ ممکن ہے کہ شعر کا حلیہ ہی بگڑ جائے۔ جیسا اوپر کہا گیا ہے کہ زمانے کی رفتار ہی جدید سے جدید تر کی طرف رہی ہے اور اس میں شاعر کا اپنا وجدان کارفرما رہا ہے۔ تو اب بھی شاعر کا اپنا وجدان شعر کو جدید تر بنانے میں اپنا کام کرتا رہے گا۔ اگر تھوڑے ہی تفحّص سے کام لیا جائے تو کلاسیکی دور کے شعراء کے کلام میں ایسے اشعار مل جائیں گے جن پر جدید ہونے کا گمان ہوگا۔ یہاں جدیدیت اور کلاسیکیت کا امتیاز بھی نہیں رہ جاتا۔ لیکن جدیدیت سے مراد اگر فن سے فرار یا شعر و نثر کے امتیاز کو ختم کردینا ہے تو ہمارے مخاطب یہ لوگ نہیں ہیں۔

اس تمہید کے بعد علیم صبا نویدی کی نعت پر نظر ڈالتے ہیں جو "اللطیف" ۱۴۲۱ھ میں شائع ہوی ہے۔ لکھتے ہیں: ؎

اک نہ اک طوفان سے ہر روز اک مڈبھیڑ ہے — تھامنے کو اپنا دامن روز آئے مصطفٰیؐ

پہلے مصرعہ میں لفظ مڈبھیڑ بہت ثقیل ہے۔ اگرچہ یہ پابند شاعری ہے مگر مصرعہ میں کوئی رچاؤ اور پختگی نہیں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں محاورہ کے غلط استعمال سے ایسا گستاخ آمیز مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ الامان والحفیظ۔ دامن اس کا تھاما جاتا ہے جس سے آدمی مدد یا نجات کا طالب ہوتا ہے "دامن تھامنے" کے بجائے یہاں "بازو تھامنے" کا موقعہ تھا بازو کمزور کا تھاما جاتا ہے۔ محاورہ کے فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب کتنی بڑی غلطی سرزد ہوی ہے۔ اور لکھتے ہیں: ؎

کس کی خاطر عالمِ امکاں کا یہ ہے اہتمام — ہم سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہے برائے مصطفٰیؐ

اس میں چند در چند غلطیاں ہیں۔ ہم صرف ایک بڑی معنوی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "ہم سمجھتے ہیں کہ" حال کو اپنی ذاتی سمجھ پر موقوف کیا ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو اپنی ذاتی سمجھ پر موقوف کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو ہماری سمجھ سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ عقول میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہماری سمجھ سے واقعہ تو یہ ہے لیکن بعض دوسروں کی سمجھ ان کے خلاف ہوسکتی ہے۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ شاعر نے اس چیز کو اپنی سمجھ پر موقوف رکھا ہے۔ جس کا حق وہ نہیں رکھتا۔ یہ تو کائنات

کا خالق ہی بتا سکتا ہے کہ کائنات کس کے لیے ہے۔ خالق کے بتانے سے ہمیں معلوم ہوا جو صرف خالق کے اختیار میں ہے شاعر اُسے اپنے ذمّہ لے رہا ہے "ہم سمجھتے ہیں" کی جگہ اگر "قولِ ربّی ہے" ہوتا تو شعر اچھا ہو یا نہ ہو بات درست ہوتی۔

مقطع دیکھیے: ؎

کون ہوگا حشر میں اپنا سوائے مصطفےٰؐ
بعد رحمت بھی صبا کو آپ سے ہے اُمید

یہاں "بھی" کا استعمال ایسا غلط ہے جس نے معنی میں عیب پیدا کر دیا ہے۔ اگر بات یوں ہوتی کہ اپنے گناہوں کے بعد بھی آپ سے رحمت کی امید ہے تو بات درست ہوتی۔ یہاں "رحمت" کو عیب کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور شعر ہے: ؎

زیرِ لب جن پُتلیوں میں مسکرائے مصطفےٰؐ
میری اپنی پُتلیاں اُن پُتلیوں میں ڈوب جائیں

"پُتلیوں میں پُتلیاں ڈالنا" کون سا محاورہ ہے؟ اس میں مدح کا کون سا پہلو ہے؟ جس ہستی کے خاکِ پاک کو مومن اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے کا آرزومند ہوتا ہے، شاعر بجائے ان کی خاکِ پا کو اپنی آنکھوں میں لگانے کے اپنی آنکھوں کو ان کی آنکھوں میں ڈبونا چاہتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کہنے والا ہی جانے! یہ شعر بھی دیکھیے: ؎

میرے آگے ضوفشاں ہے نقشِ پائے مصطفےٰؐ
تیرگی کی بھیڑ سے باہر نکلنا ہے مجھے

قرآن میں ہے اللہ ولیّ الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور: یعنی اللہ ان کا دوست ہے جو ایمان لائے انھیں وہ (کفر کی) تاریکی سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے۔ قرآن میں یہاں تیرگی سے مراد کفر کی تیرگی ہے کیوں کہ ایمان لانے والا کفر چھوڑ کر ہی ایمان لاتا ہے۔

لیکن یہاں شاعر کہتا ہے کہ اُسے ابھی تیرگی سے باہر نکلنا ہے۔ مگر کیا ابھی اُسے ایمان کی روشنی نہیں ملی۔ اگر تیرگی سے مُراد کفر کے علاوہ کچھ اور ہے تو شاعر کو یہاں صراحت سے کام لینا چاہیے تھا۔ پہلا مصرعہ یوں ہوتا تو یہ اعتراض جاتا رہتا۔ ع "تیرگی کی بھیڑ سے تسکرِ خدا میں بچ گیا۔" یوں یہاں لفظ "بھیڑ" بھی حشو ہے۔

آگے اور دیکھیے: ؎

یہ زمیں سایہ بنی تھی زیرِ پائے مصطفےٰؐ
دوسرے سایہ کو کیا دیتی جگہ اپنی جگہ

دونوں مصرعوں میں کیا ربط ہے؟ اور شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟ یہ وہی سمجھے!! یہ شعر بھی ہے: ؎

گونجتی ہے دونوں عالم میں صدائے مصطفےٰؐ
مسجد و منبر میں اس کو قید کیوں کرتے ہیں لوگ

شعر کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ پیغامِ مصطفےٰ علیہ السلام جو دونوں عالم میں گونجتا ہے وہ دونوں عالم میں نہ گونجے اس لیے اس کو مسجد کے اندر قید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی مسجد میں یہ پیغام نہ سنانا چاہیے حالانکہ شاید شاعر کے دل میں یہ بات رہی ہوگی کہ چاہیے کہ مسجد میں پیغام محدود نہ کریں بلکہ اسے سارے عالم میں پھیلائیں اگر مقصد یہ ہے تو پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا: ع "مسجد و منبر میں کیوں محدود کرتے ہیں اسے؟"

لیکن پھر بھی شعر صفائی بیان سے محروم ہے۔ شعر میں جہاں صراحت کی ضرورت ہو وہاں ابہام یا گنجلک بیان عیب ہے اس میں لفظ منبر حشو ہے۔

اللطیف کے اسی شمارے میں ایک اور نعتیہ کلام ہے اس کا مقطع یوں ہے: ؎

مرے نوری پیا آمر تو تجھ میں حق کو پاتا ہے — نبی ہے اور علی ہے اور ولی ہے یا رسول اللہ

یہاں ایک ہی ذات کو نبی، علی اور ولی سب کہہ دیا۔ اس کی کوئی تاویل بھی کر دی جائے تو ردیف کے استعمال کی طرف توجہ نہ دینے کے سبب اس کی معنویت او جھل ہو گئی۔ یہاں ردیف سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ندا التجا کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس طرح ہے جیسے کسی بے خبر کو آگاہ کر رہے ہوں۔

یہاں یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ پیر کو نبی، علی کہنا درست ہو گا یا نہیں! اصل میں بعض وجودی صوفیا جب مسئلۂ وحدت الوجود پر بحث کرتے ہیں تو خدا، رسول، فرشتہ اور تمام اشیاء کو ایک کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ پھر تعینات کی بھی بات کرتے ہیں اور اس کی تاویل کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنے کو خدا کہنے کا طریقہ یوں اختیار کیا ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ وجودی نقطۂ نظر ہے اور اسی نقطۂ نظر سے تاویل کی ہے۔

کبھی یہ بات اس طرح بھی کسی نے کہی کہ اس میں دعویٰ پیدا ہو گیا۔ حسین بن منصور نے انا الحق کہا تو اس میں دعویٰ پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ اس کا حال تھا۔ اس لیے خود اس کو تاویل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر دوسرے بغیر تاویل کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ فرعون نے بھی دعویٰ کیا لیکن یہ اس کا حال نہ تھا۔ اس لیے ملعون ہو گیا۔

وحدۃ الوجود کے باوجود تعینات میں ہر مرتبہ دوسرے سے الگ ہے۔ اس لیے مولانا جامی نے کہا: کہ ؎

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد — گر فرق مراتب نکنی زندیقی

اسی نعت میں ایک شعر یوں ہے: ؎

بلا لو سوئے طیبہ اب کہاں تک ہند میں ٹھہروں — مدینہ علم کا تم، در علی ہے یا رسول اللہ

شاعر طیبہ اس لیے جانا چاہتا ہے کہ رسول علم کا مدینہ ہیں اور علی علم کا در ہیں۔ یہ دونوں باتیں الگ الگ دونوں مصرعوں میں درست ہیں۔ لیکن دونوں مصرعوں میں کوئی پیدا نہیں ہو سکا۔

اس نعت سے صرف ایک شعر اور نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں: ؎

ملے جس کو ہو تم اس کو یقیناً مل گیا سب کچھ — خدا اور خلق ساری مل گئی ہے یا رسول اللہ

جسے خدا اور رسول مل گیا اسے دنیا اور دنیا والوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس کا دل مخلوق سے دور بھاگتا ہے۔ وہ مخلوق کے درمیان میں رہ کر بھی ان میں مشغول نہیں ہوتا اور نہ یہ تمنا کرتا ہے کہ مخلوق اس کی حلقہ بگوش ہو۔ یہاں

خدا کے ساتھ مخلوق کے ملنے پر اظہار تشکر کرنا یہ معنی دیتا ہے کہ شاعر کی تمنا یہ دل میں تھی کہ مخلوق بھی اس کی حلقہ بگوش ہو جائے۔ لیکن جس کی یہ تمنا ہوگی اُسے نہ خدا ملے گا نہ رسول۔ وہ خدا سے دُور ہی رہے گا۔ ایک دل میں یہ دو تمنائیں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں۔ مخلوق میں مشغولیت پراگندگی خاطر کا سبب ہے۔ حضرت نصیر الدین محمودؒ چراغ دہلوی فرماتے ہیں کہ جس کے پیچھے جتنے علائق ہوں گے اتنا ہی وہ پراگندہ خاطر اور پریشان رہے گا۔ ان علائق سے پیدا ہونے والے خیالات نماز اور وظائف میں بھی مزاحم ہوں گے۔

سالنامہ اللطیف ایک مشہور و باوقار دینی درس گاہ کا ترجمان ہے۔ اس کے مدیر دل میں خود اس کے اساتذہ ہیں۔ اگر ان کی نگرانی میں اللطیف میں اس طرح کے کلام چھپتے رہے تو اس کا وقار ختم ہو جائے گا۔ اس سے لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اگر دین کا واسطہ نہ ہوتا تو میں ہرگز قلم نہ اٹھاتا۔ لیکن قلم اٹھانے کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ میں شروع ہی سے اللطیف سے وابستہ رہا ہوں۔ اس کے متعلق آگے سطور میں عرض کروں گا۔ یہاں نعت کا ذکر ہو رہا ہے۔ نعت لکھنے کا جب تک سلیقہ نہ ہو اور زبان و قلم پر جب تک قدرت نہ ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شاعر اپنے حدود پر اگر خود نظر نہ رکھ سکے تو اس کی جرأت نہ کرنا چاہیے۔ جدیدیت پسند شاعروں سے بھی گزارش ہے کہ وہ نعت اور مذہبی موضوعات پر اس کو نہ آزمائیں۔ شاعری کا بڑا میدان سامنے ہے۔ دوسرے موضوعات پر جو چاہیں لکھیں مجھے کوئی تعارض نہ ہوگا۔ نعت لکھنے سے پہلے کم از کم قرآن سے سورہ حجرات کا ترجمہ پڑھ لیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالٰی نے خود اپنے محبوب کے ادب کی کیا تعلیم دی ہے۔ عرفی جس کی بلندئ فکر کا اعتراف بڑے بڑے دانش وروں نے کیا۔ ایک نعتیہ قصیدہ میں لکھتا ہے: ~

عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحراست آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را!

عرفی جلد بازی نہ کر یہ رہ نعت ہے۔ اس راہ پر چلنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے اس لیے بہت احتیاط سے چل۔ ~

شایستہ بدست آر کہ بینند دریں شہر شائستگی جنس چہ بسیار چہ کم را

یہاں بڑی احتیاط سے وہی زبان اور بیان اور مضامین اختیار کر جو نعت کے لائق ہوں۔ کیوں کہ یہاں صرف ایسی شایستگی کو دیکھتے ہیں خواہ کم لکھا جائے یا زیادہ۔

شاعر دوسروں کو زبان عطا کرتا ہے یعنی غیر شاعر کے دل کی بات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" مسلمان کے لیے رسول سے محبت فرض ہے۔ کتنا ہی بے عمل مسلمان ہو لیکن اپنے آقا و مولیٰ رؤف رحیم کے نام کو سنتے ہی اس کا دل تعظیم سے جھک جاتا ہے۔ اس کے اندر بھی محبت کا جذبہ کبھی نہ کبھی ضرور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسے اپنے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں یہ صورت بہت اچھی ہے کہ وہ دوسرے اچھے معتبر شاعروں کے نعتیہ اشعار پڑھ کر اور سُن کر اپنے جذبہ کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔ ورنہ بزعم خود اگر اُسے دعوائے شاعری ہو اور

نعت کے آداب سے بے خبر یا زبان و بیان کے محاسن و معائب پر نظر نہ رکھتا ہو اور فصاحت و بلاغت کے معانی سے بے خبر ہو تو اس پر علامہ جلال الدین دوانی کا یہ شعر صادق آئے گا۔! ؎

آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند ۔۔۔ در جہل مرکب ابدالدہر بماند

اس مضمون میں اللطیف کا ذکر کرنا ضروری تھا کیوں کہ اس ساری بحث کا منبع اللطیف ہی ہے۔ حضرت مکان، مدرسۂ لطیفیہ اور اللطیف سے جنوبی ہند کے لوگ عام طور سے واقف ہیں۔ لیکن شمال میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس لیے اگر یہاں اللطیف کا بھی ضروری تعارف نہ کرایا جائے تو مضمون تشنہ رہ جائے گا۔

دار العلوم لطیفیہ ویلور میں ایک قدیم دینی درس گاہ ہے۔ جہاں سے علم دین حاصل کر کے لوگوں نے پورے جنوب ہند میں دینی علوم کو پھیلایا اور دوسرے حصوں میں دینی مدرسے قائم کئے۔ دار العلوم لطیفیہ جس مکان میں واقع ہے اس کا نام عرف عام میں حضرت مکان ہے۔ خانوادۂ حضرت مکان میں یکے بعد دیگرے کئی نسلوں تک ولی ابن ولی ابن ولی ہوتے رہے ہیں۔ ان میں ہر ایک اپنے وقت میں نابغۂ روزگار تھے۔ اور تصوف کی بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی۔ یہ سب اقطابِ ویلور کے نام سے مشہور ہیں۔ دار العلوم لطیفیہ انھیں بزرگوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ آخر میں یہاں حضرت اقدس مولانا ابوالحسن صدر الدین سید شاہ محمد طاہر قادری معروف بہ حضرت پیر نے اللطیف نام کا ایک سالنامہ نکالنا بھی شروع کیا جس کے دو بنیادی مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ مدرسۂ لطیفیہ کے طالب العلموں میں تحریری لیاقت پیدا کرنا۔ دوسرے اس میں خانوادۂ اقطابِ ویلور کی علمی نگارشات کو جو کہ عربی اور فارسی میں ہیں اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنا تاکہ عام لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

اس مدرسہ کے طلباء کے مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چوں کہ ابھی وہ زیرِ تربیت ہوتے ہیں یہ ان کی تحریروں میں نہ بڑا علمی وقار ہو سکتا ہے اور نہ وہ اہلِ قلم کی طرح پختگی سے لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان کی ان کم معیار والی تحریروں کو شائع کرنا اللطیف کا بنیادی مقصد ہے تاکہ اُن کی تربیت اور حوصلہ افزائی ہو سکے۔ یہی طریقۂ تعلیم ہے۔

اقطابِ ویلور نہ صرف بلند پایہ ولی تھے بلکہ اس کے ساتھ ان میں سے ہر ایک عارف بھی تھے۔ اُن کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ جن میں جواھر السلوک اور جواھر الحقائق کو امتیازی شان حاصل ہے۔ ریاضت و مجاہدہ اور زہد و تقویٰ وغیرہ کے سبب بندہ پر فضلِ الٰہی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ اسے اپنا ولی بنا لیتا ہے یہ ولایتِ خاصہ ہے۔ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور ولایت عامہ جو ہر مومن کے لیے ہے اس کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے۔ اللہ ولی الذین آمنو یخرجھم من الظلمت الی النور۔ لیکن عارف وہ صاحبِ ولایت ہے جو صاحبِ معرفت بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ اللطیف میں جواھرِ السلوک اور جواھر الحقائق کا اردو ترجمہ پڑھتے ہوں گے ان کو کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ

معرفت کیا ہے؟ صوفی صفاتِ الٰہیہ سے موصوف ہوتا ہے۔ جس کے اندر جتنا زیادہ ان صفات کا ظہور ہوگا وہ اتنا ہی بڑا عارف ہوگا۔ صوفی کی تعریف یہ کی گئی ہے الصوفی ھوالموصوف بصفات اللہ سوی الوجوب والقدم (صوفی وہ ہوتا ہے جو صفاتِ الٰہیہ سے موصوف ہو سوائے وجوب اور قدم کے) حدیث میں بھی ہے کہ: تخلقوا باخلاق اللہ (یعنی اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو) جیسے قرآن میں صبغۃ اللہ کہا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ رنگ کتنا اچھا ہے، رنگ سے مراد صفاتِ الٰہیہ ہیں۔

حضرت قطب ویلور کی کتابیں تصوّف کی وہ بلند پایہ کتابیں ہیں جو صوفیا کی اعلیٰ ترین کتابوں کی صف میں آتی ہیں مثلاً مثنوی مولانا روم، عوارف المعارف، کشف المحجوب، لطایف اشرفی، مکتوبات و ملفوظات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور امام غزالی کی تصانیف۔ البتہ ان میں ہر ایک کا رنگ جدا ہے اور طرز جدا ہے۔ اس کا سبب اُن کا اپنا طریقۂ تعلیم بھی ہے۔

انھیں اقطاب ویلور میں ایک حضرت ذوقی بھی تھے جو شاعری میں وفور گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے فارسی شعراء میں وہ ایک ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا سارا کلام محفوظ نہ رکھ سکا۔ راقم نے ان کے کرم خوردہ قصاید بڑی دقّتِ نظر سے نقطوں اور شوشوں کی مدد سے پڑھ کر ان کا ترجمہ کیا اور حواشی لکھے جو اللطیف میں بالاقساط شائع ہوتے رہے۔ اگر حضرتِ ذوقی کا کلام علّامہ شبلی کے زمانہ میں چھپا ہوتا اور ان تک پہنچا ہوتا تو یقیناً اس کا تفصیلی ذکر شعر العجم میں ہوتا۔ اس زمانہ میں قدر دان نہ رہے۔ پھر بھی اللطیف میں ان نابغہ روزگار کی تحریروں کے اردو ترجمے شائع ہو کر لوگوں کے لیے تصوّف کے متعلق معلومات کا ذریعہ بنتے ہیں جس سے کم از کم اتنا تو فائدہ ہوتا ہے کہ لوگ تصوّف کی حقیقت سے کچھ نہ کچھ واقف ہو سکتے ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ صحیح و غلط میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ مولانا روم بہت پہلے ہی متنبہ کر چکے ہیں:

اے بسا ابلیس آدم صورت است پس بہر دستے نباید داد دست

اس موقعہ پر جب کہ اللطیف کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے اس کے مدیروں کا ذکر نہ کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

اللطیف جو مدرسۂ لطیفیہ کا ترجمان ہے، اس میں مدرسہ کی سالانہ روداد بھی شائع ہوتی ہے جسے اس کے مدیر ترتیب دیتے ہیں۔ اداریہ بالعموم حافظ بشیر الحق لکھتے ہیں۔ حافظ بشیر الحق ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ وہ ایک مصلحِ قوم کی طرح قوم کی نبّاضی کرتے ہیں اور ایک دردمند عالم کی طرح مدلل اور مستحکم انداز میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ہر مرض کا علاج بتاتے ہیں۔ ان کی یہ تحریریں اس قابل ہیں کہ یکجا کر کے کتاب کی شکل میں شایع کی جائیں۔ لیکن ان کا پڑھنے والا کون ہوگا؟ ہندوستان میں اردو والوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ غیر ضروری کاموں پر کثیر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن دس پانچ روپے کی کتاب خرید کر پڑھنا گوارا نہیں کرتے۔

یہ ایک ایسی زوال یافتہ قوم کی علامت ہے جو اپنا شعور کھو چکی ہو۔ علماء زبان وقلم سے انھیں جگانے کی کوشش ہی کرسکتے ہیں لیکن اگر وہ بیدار نہ ہوں تو اس کا کیا علاج ہے۔ اللطیف تنہا وہ سالانہ مجلّہ ہے جو ایک دینی درس گاہ سے شائع ہوکر مفت لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس سے پورا فائدہ اٹھانا عوام کا کام ہے۔ لیکن کیا اسے اس لیے پڑھنا چاہیے کہ مفت میں ملتا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ایک نہایت محدود دائرے میں اس کے کتنے اثرات ہوسکتے ہیں؟ یہ باتیں قوم کے سوچنے کی ہیں۔

یہ مضمون لکھ چکا تھا کہ میری نظر سے ایک کتاب بنام "اردو میں نعتیہ شاعری" گزری۔ جسے ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ترتیب دی ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تو ایک نعتیہ کلام پر نظر ٹھہری۔ چوں کہ یہ ایک جدیدیت پسند شاعر کی ذہنی کاوش کا نتیجہ تھی۔ اس لیے اس پر زیادہ متوجہ ہوا۔ کلام غزل کے فارم میں ہے۔ جدیدیت اور نعت کے تعلق سے تجربات میں نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ اس پر مزید دلیل سامنے آئی۔ اس لیے بطور ضمیمہ مضمون میں اضافہ کر رہا ہوں۔ پہلے وہ پوری غزل نقل کر رہا ہوں۔

۱ ترے حدیث ترے روبرو سناؤں تجھے — یہ آرزو ہے کبھی آئینہ دکھاؤں تجھے
۲ میں اپنی ذات کا غارِ حرا کروں تعمیر — بصد نیاز و عقیدت وہاں بلاؤں تجھے
۳ مرا وقار بھی تو ہو مری پناہ بھی تو! — میں خود زمین بنوں آسماں بناؤں تجھے
۴ مرے لیے تو تری یاد بھی محال ہوئی — کہ یاد کے لیے لازم ہے بھول جاؤں تجھے
۵ غمِ جہاں، غمِ جاں اور غمِ ورائے جہاں — میں کون کون سا زخمِ نہاں دکھاؤں تجھے
۶ برس رہی ہے ترے رُخ کی چاندنی تجھ پر — قریب آ کہ میں سینے بھی لگاؤں تجھے
۷ تو مجھ سے روٹھ مگر روٹھنے سے پہلے بتا — تو روٹھ جائے تو میں کس طرح مناؤں تجھے
۸ یہ میرا شوق کہ میں تجھ کو بر ملا دیکھوں — یہ میرا رشک کہ میں خود سے بھی چھپاؤں تجھے
۹ کہاں کہاں مجھے تیرے کرم کی حاجت ہے
تو جانتا ہے تو میں کس لیے سمجھاؤں تجھے

اوپر کے اشعار میں ایک تو ردیف کا استعمال مناسب نہیں ہوا ہے۔ مولانا احمد رضا خان رحؒ نے بھی ایک نعتیہ کلام میں یہ ردیف استعمال کی ہے۔ لیکن وہاں مخصوص معنویت کے ساتھ ہے۔ ضمیر کے استعمال پر ہم نے گزشتہ سال مضمون میں اسی مجلّہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔ شعر نمبر ۶، ۷، ۸ بالکل غزل کے اشعار ہیں۔ خالص غزل کے مضمون کو نعت پر چسپاں کر دینا سخت بے ادبی ہے۔ شعر نمبر ۷ میں ایک بے خبری کا اظہار یوں ہے کہ شاعر نے جرأتِ نازیبا سے کام لیا ہے۔ خود رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم جس کو سینے سے لگا لیا تو اس کی قسمت چمک جائے۔ ہم تو آپ

کی خاکِ پا ہی کو سر کا تاج بنانے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اگر آپ خود کسی کو سینے سے لگالیں تو یہ آپ کا بے پایاں فضل وکرم ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے ایک غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سینے سے لگا کر اُن کے علوِّ مرتبہ کو ظاہر کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ آزاد بھی کر دیے گئے۔ شاعر کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ محبوبِ رب العالمین کو خطاب کر رہا ہے نہ کہ دنیا کے معشوقانِ مجازی کو۔ شعر نمبر ۷ میں یوں کہنا کہ " تو مجھ سے روٹھ " نعتیہ کلام میں سخت نازیبا ہے۔ یہی حال شعر نمبر ۸ کا ہے۔ شاعر اگر سورۂ حجرات کی تفسیر پڑھ لیتا تو اُسے کچھ اندازہ ہوتا کہ یہاں ادب کو کس طرح مدِّ نظر رکھنا چاہیے۔ شعر نمبر ۳ میں بھی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کے صدقے میں زمین و آسمان اور پوری کائنات بنی ہے۔ جس کے بلند مرتبہ کے آگے آسمان بہت پست ہے۔ شاعر اس کو آسمان بنانا چاہتا ہے۔ ع

بدیں عقل و دانش بباید گریست

نعتِ شریف



مولانا ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ افسر صبغۃ اللّٰہی قاسمی۔ شفا ڈسپنسری
گڈ پالم ۶۳۲۶۰۲

مرے آقا کی یادیں بڑھ گئیں جی بھر کے رونے میں
نہیں کوئی مزا دنیا کی دولت اور دفینے میں

مجھے لے چل خدایا اب ترے کعبے مدینے میں
کمی ہے کونسی یارب؟ بتا تیرے خزینے میں

مرے ساقی وہ زمزم ہو کہ بادہ جامِ کوثر ہو
مزا آئے گا مجھ کو آپ کے ہاتھوں سے پینے میں

تمنا ہے میری جاں اُن کے قدموں پر فدا کر دوں
مرے سرکار جب ہوں خوش مزا آئیگا مرنے میں

قسم اللہ چنبیلی مُشک عنبر میں نہیں خوشبو
عجب خوشبو ہے دیکھو میرے آقا کے پسینے میں

عقیدت جب کہ سچی ہو، مُرادیں پوری ہوتی ہیں
کہیں ہم ہوں مگر دل ہو سراسر جب مدینے میں

دلِ بیتاب سنبھل کے چل، سکونِ دل میسّر ہو
کہ دیدارِ محمدؐ کی تڑپ ہوتی ہے سینے میں

بسا کر اُن کی یادوں کو تو دل میں اے حکیم افسرؔ
حریمِ قُدس کے صدقے، مزا آئیگا جینے میں

بسم اللہ

کے اعداد ۷۸۷ نہیں بلکہ ۷۸۶ ہیں!

ڈاکٹر حکیم سید افسر پاشاہ۔ بی یو ایم ایس، مالکِ شفاء ڈسپنسری۔ نڈوپیٹ۔ گڑیاتم۔ ۶۳۲۶۰۲

نوٹ: آج سے ٹھیک اٹھارہ سال پہلے دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ "ھدیٰ ڈائجسٹ" نئی دہلی کے ذریعہ ایک نیا فتنہ ابھرا جس نے زمانہ قدیم سے چلی آنے والی روایات کا قلع قمع کر دیا اور پانی پھیر دیا۔ عوام و خواص کو اچنبے میں ڈال دیا اور حیرت زدہ کر دیا۔
وہ یہ کہ اب تک بسم اللہ کے اعداد جو ۷۸۶ تھے اور جسے اکثر علماء و مشائخ زمانہ قدیم سے اپنی تعویذوں میں لکھتے چلے آتے تھے یہ نہ صرف غلط ہے بلکہ ایک یہودی سازش کا نتیجہ ہے۔ پھر اس دعوٰی پر دلیل کی اپنی من مانی مزعومات کا کھوکھلا قصر بھی تعمیر کر دیا۔ اس پر ادھر سے حضرت مولانا حکیم سید افسر پاشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی نے ایک مدلل اور مفصل جواب مرحمت فرمایا جس سے الحمد للہ سب کی الجھنیں رفع ہو گئیں اور حقیقت کیا ہے یہ واضح ہو گئی۔ اللہ حکیم صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا کرے کہ انھوں نے وقت کی ایک الجھی گتھی کو آسانی کے ساتھ سلجھا دیا اور حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔

یہ مضمون ادھر کے روزنامہ "مسلمان" مدراس بابت ۱۷ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ نیز ماہنامہ آستانہ دہلی میں بھی شائع ہوا ہے۔ پھر اس کے ٹھیک بارہ سال بعد ۱۹۹۵ء میں یہ فتنہ ایک نئے روپ میں ابھرا اور اس کے ساتھ کچھ مزید اشکالات بھی تھے۔ جنھیں مدیر ماہنامہ آستانہ دہلی نے اپنے ماہنامہ کے ذریعہ جواب طلب کیا تھا۔ تو اس وقت بھی یہی حکیم صاحب موصوف مدظلہ العالی نے تفصیلی جواب مرحمت فرمایا جو ماہنامہ آستانہ دہلی بابت ماہ جنوری ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اس کے ٹھیک چھ ۶ سال بعد ۲۰۰۱ء عین حال میں یہ فتنہ پھر سر اٹھایا اور اس سے بعض تعلیم یافتہ طبقہ بھی متاثر ہو گیا۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر تبرکاً کسی نے ۷۸۶ سات سو چھیاسی کی تعداد پر اپنا مہر رکھ دیا۔ پھر کیا ہوا؟ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ یہ جھگڑا طول بھی پکڑا اور کافی وقت بھی لے لیا۔ اس لیے میں نے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا کہ اس کو اپنے جریدہ سالانہ اللطیف میں بھی شائع کرنا چاہیے۔ چناں چہ یہ مضمون روزنامہ مسلمان مدراس بابت ۱۹۹۳ء سے بعینہٖ نقل کر دا کر ضرورت کے تحت اب کی تیسری مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔ امید ہے حضرات قارئین 'اللطیف' اس سے مزید مستفید و مستفیض ہوں گے۔ سید شاہ بلال احمد شطاری قادری، نائب ناظم۔

ابھی حالیہ اسی دسمبر ۸۳ء کے "ہدیٰ" ڈائجسٹ پر نظر پڑی، جس میں فضل الرحمٰن نعیم صاحب کا مضمون بعنوان "بسم اللہ" کے اعداد ۷۸۶ یا ۷۸۷" ؟ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں چند باتیں جو میرے ذہن میں آئی ہیں یہ عرض کر دی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے مضمون نگار کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ مضمون کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے یہ سوچ لے کہ نفسِ مسئلہ کو موضوعِ بحث سے تعلق کس درجہ میں ہے ؟ .... پھر جب کہ وہ کسی زبان و الفاظ سے اور خاص کر عربی زبان اور وہ بھی قرآن کی زبان سے متعلق ہو تو یہ اپنے اندر جس قدر وجیز ہے اسی قدر اہم و عظیم اور دقیع بھی۔

یہ مسلّمات سے ہے کہ ہر زبان کی ایک خاص رسم ہوتی ہے۔ اسی رسم خط پر الفاظ کا اجراء و املاء بھی ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے

الفاظ تابع ہیں رسم کے اور رسم متبوع ہے الفاظ کی یعنی رسم الفاظ کی تابع نہیں ہوتی ہے ماہرین رسم نے اس کو قیاسی اور غیر قیاسی کی دو شقوں میں بانٹ دیا ہے۔

۱۔ رسم خط قیاسی اور اس کی چند مثالیں:

(الف) قیاسی رسم اردو اور فارسی میں: جیسے: ہنسی، خشی، خاہر، خاب، خاہش، خش، خد، خاند، خاہاں، خرد، خرشید وغیرہ۔

(ب) قیاسی رسم انگریزی میں: جیسے "Isteshan"، "Nyt"، "Kalkatta" اور "Iskool" وغیرہ۔

(ج) قیاسی رسم عربی میں: جیسے الرحمان۔ مالك۔ العالمين، اسماعيل، ابراهيم، باقيات صالحات عابدات، قانتات وغیرہ

۲۔ رسم خط غیر قیاسی اور اس کی مثالیں:

(الف) غیر قیاسی رسم اردو اور فارسی میں: جیسے ہنسی، خوشی، خواہر، خواب، خواہش، خوش، خود، خواند، خواہاں خورد، خورشید وغیرہ۔

(ب) غیر قیاسی رسم انگریزی میں: جیسے "Station"، "Night"، "Calcutta" اور "School" وغیرہ

(ج) غیر قیاسی رسم عربی میں: جیسے الرحمٰن، ملك، العٰلمين، اسمٰعيل، ابرٰهيم، بٰقيٰت، صٰلحٰت، عٰبدٰت، قٰنتٰت وغیرہ۔

اس تفصیل کے بعد عرض ہے کہ جس طرح خوشی کو خشی اور Calcutta کو Kalkatta لکھنا عیب ہے اسی طرح "رحمٰن" کو "رحمان" لکھنا بھی عیب ہے۔

جناب نعیم صاحب محترم نے جو انکشاف کیا ہے اور بیڑا اٹھایا ہے، یہ اردو یا فارسی کی زمین سے متعلق نہیں بلکہ قرآنی الفاظ کی ایک سنگلاخ اور سخت ترین زمین سے متعلق ہے۔ جہاں ماہرین علم الاعداد و جمل کی نہیں بلکہ ماہرین رسم الخط کی متابعت کی ضرورت ہے۔ اُن کے بغیر حیرت و استعجاب کی بات اپنی جگہ رہے گی ہی۔ جیسا کہ خود نعیم صاحب کے الفاظ اس کے شاہد و گواہ ہیں: کہ "حیرت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں میں علم الاعداد کے "لاتعداد" ماہرین نے کیوں آج تک یہ غور نہیں کیا؟"

بھلا مانس! انھوں نے تو غور کیا ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے، وہ ٹھیک کیا ہے اور بسم اللہ الخ کی ابجد پر اُن کا حساب و استخراج برا پنی جگہ اٹل ہے اور لمریزل ہے۔ اس معاملہ میں آپ پھر سے غور فرمالیں۔ ان کو غور کرنے کی اب چنداں ضرورت نہیں ہے، یہ 786 اپنی جگہ آج بھی فٹ ہے اور بالکل ٹھیک ہے۔

لفظِ "رحمٰن" قرآن کی خاص رسم خط غیر قیاسی ہی سے ہے۔ اس کے اندر آپ اور ہم دخل اندازی کے مجاز نہیں ہیں "رحمٰن" پورے قرآن کے اندر بغیر الف کے ساتھ ہی مرسوم ہے۔ ہر سورۃ کی ابتداء بسملہ میں، سورۂ فاتحہ میں اور اسی طرح جہاں بھی دیکھئے گا

اس کو اسی طرح بلا الف محض الفِ مقصورہ یعنے کھڑا زبر کے ساتھ ہی لکھا پائیے گا۔

خود آپ نے بھی اہلِ رسم کے تتبع میں اپنے نام کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہے، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا فضل الرحمٰن میں میم کے بعد والا الف حسبِ مرسوم محذوف ہی رکھا ہے۔ پھر یہ اصرار کہ الف کو بحال کیا جائے، آخر کہاں تک صحیح ہے ؟ ... یہ جس قدر حیرت انگیز ہے، اسی قدر معنی خیز بھی : ؎

زُلفِ دراز بن گئی زنجیرِ پائے یار　　　لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

آپ کو جب اس پر اشکال ہے تو پہلے اپنے نام کے ساتھ اس طرح فضل الرحمان لکھوایا ہوتا۔ اگر آپ اس طرح الف کے ساتھ لکھوالیتے تو پھر بھی آپ اپنے مطلب میں یہاں پورے نہ اُترتے اور ناکام ہی ٹھہرتے۔ آپ کے حساب کے مطابق مان لیجیے کہ یہاں ایک الف محذوف ہے جیسے علمائے اہلِ رسم نے بھی نظرانداز کر دیا ہے، تو پھر میں عرض کروں گا کہ جب رحمٰن کے میم کے بعد ایک الفِ مقصورہ کا شمار ہو رہا ہے تو لامحالہ لامِ جَلَالَہ (اللّٰہ) کے دو لاموں کے بعد والے الفِ مقصورہ (یعنی کھڑا زبر) کا بھی آخر آپ کے حساب سے اضافہ اور شمار ہونا چاہیے تھا نا ؟ ...... پھر تو بسم اللہ کے صحیح اعداد سات سو چھیاسی ۷۸۶ سے ہٹ کر آپ کی معلومات اور منطق کی رُو سے سات سو ستاسی ۷۸۷ بلکہ اٹھاسی 788 بن رہے ہیں: ع "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

یہ بسم اللہ الخ اللہ کا کلام ہے۔ اس میں نہ تو حذف و اضافہ یا ترمیم و تنسیخ کی گنجائش ہے اور نہ اس کے اندر تاویل و تحریف کی ضرورت ہی۔ قرآن کے آگے خود اہلِ رسم کے قلم و زبان بھی ساکت و بے جان ہیں۔ یہ قرآن کا اپنی جگہ اعجاز بھی ہے اور اس کا خاص غیر قیاسی رسم خط بھی۔ رحمٰن اور مٰلك پر قیاس یہ چاہتا ہے کہ ان کی رسم مع الالف ہو۔ یعنے رحمان اور مالك مگر قرآن کی غیر قیاسی رسم یہ کہتی ہے کہ "نہیں" اس کی رسم اسی طرح رہے گی جس طرح کہ ہم نے کہا ہے۔

خواب، خواہش، خوشی اور خویش کا رسم یہ چاہتا ہے کہ ان کو بغیر واؤ کے لکھا جائے۔ لیکن اہلِ زبان کا غیر قیاسی رقم یہ چاہتا ہے کہ تم ان کو اسی طرح لکھو جس طرح ہم کہتے ہیں۔ ورنہ تمہارے اس رسم کو ہم غلط قرار دے دیں گے۔

اسی طرح اسٹیشن کی رسم غیر قیاسی "station" ہے حالاں کہ "Istashan" ہونا چاہیے تھا مگر ایسا لکھنا اہلِ زبان و رسم کے نزدیک نہ صرف معیوب بلکہ معتوب بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ماہرینِ علم الاعداد کے نزدیک تلفظ کا شمار نہیں بلکہ الفاظ کا شمار ہوتا ہے۔ یعنے انہیں الفاظ کا شمار ہوگا جو لکھنے میں آئیں، پڑھنے میں نہیں۔ جس طرح محمّد کی میم، منوّر کی واؤ اور تبحّر کی حا پر تشدید ہونے کے باوجود حرفِ مشدّد حسابِ جمل میں بجائے دو کے ایک ہی حرف گردانا ہے اور تلفظ و ادائی کا شمار نہیں کیا ہے۔ اسی طرح اللہ اور رحمٰن کے دونوں الفِ مقصورہ اور کھڑے زبروں کا جو پڑھنے میں تو آتے ہیں مگر لکھنے میں نہیں۔ ماہرینِ علم الاعداد نے ان کا شمار و حساب ہی نہیں کیا ہے۔ مزید توضیح کے لیے عرض ہے :

بسم اللہ = ۱۶۸
ب س م ا ل ل (ا) ہ
۲ ۶۰ ۴۰ ۱ ۳۰ ۳۰ × ۵

الرحمٰن = ۳۲۹
ا ل ر ح م (ا) ن
۱ ۳۰ ۲۰۰ ۸ ۴۰ × ۵۰

الرحیم = ۲۸۹
ا ل ر ح ی م
۱ ۳۰ ۲۰۰ ۸ ۱۰ ۴۰ = ۷۸۶

محترم نعیم صاحب فرماتے ہیں کہ:

"سیدھے سادے اور اپنے دین سے محبت کرنے والے مسلمانوں نے غیروں کے اس بے ضرر منصوبے کی ضرر رسانیوں پر غور نہ کیا اور جو بہانہ اور جواز انھوں نے تراشا تھا کہ بسم اللہ کی عبارت تحریر کرنے سے سوءِ ادبی کا امکان ہے، اسے قبول کر لیا۔"
("ھدیٰ ڈائجسٹ")

جواباً عرض ہے کہ اس میں شک نہیں کہ یہ آیت بڑی رحمتوں اور برکتوں والی آیت ہے۔ خط و کتابت اور تحریروں میں اس کا اندراج باعث ثواب بھی ہے اور باعث عتاب بھی۔ جو واقعی بے ادبی کا سبب ہے۔ اس پہ غیروں نے نہیں اپنوں نے، اسلام دشمن عناصر یا معاندین یہ مغربی مصنفین یا انصاف پسند مستشرقین نے نہیں بلکہ خود اپنے علمائے دین کے ماہرین علم جمل و حساب نے اس کے اندر بڑی محنت کی اور ایک بسم اللہ ہی نہیں بلکہ پورے قرآن مجید کے حروف و الفاظ کا حساب لگا کر ہم پہ بڑا بھاری احسان کیا ہے اور پھر اس کے متعدد مصالح و حکم اور فوائد بھی ظہور پذیر ہیں۔ مثلاً

۱۔ بڑی بڑی سورتوں کا حصار محض ایک، دو انچ کے اندر بھی ہو جاتا ہے۔
۲۔ تعویذ اور فلیتوں میں ان کا نقش اُتارنا آسان بن گیا ہے۔
۳۔ اس طرح کے نقش کو اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں میں دینے سے کوئی حرج بھی نہیں ہے۔
۴۔ حسب قانونِ شرع جس طرح بسم اللہ الخ یا اور کسی آیت کا بلا وضو لکھنا جائز نہیں ہے، اسی طرح اس کا بلا وضو چھونا بھی جائز نہیں ہے۔

خط و کتابت اور تحریروں میں، شادی بیاہ کے رقعوں اور تہنیتوں میں اور غیر مذہبی عام رسائل اور اخباروں میں اس کا اندراج کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اسلامی غیرت و حمیت اسے کیسے برداشت کر سکے گی؟ جب کہ اس کا بلا وضو نہ لکھنا جائز نہ چھونا جائز! ـــــ اس پہ مزید طرفہ تماشا یہ کہ عوام ان کو پڑھ کر یا تو نیچے پھینک دیتے ہیں یا ردی یا اپنے بچوں کے تحویل کر جاتے ہیں۔ یا پھر یہ کاغذات کسی پکوڑی کی دکان کی نذر ہوتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر یہ اسی مطلب میں آتے ہیں جس سے بری طرح بے ادبی کا پہلو ابھرتا ہے۔ مانا کہ لکھنے والے نے اس کو با وضو لکھا ہوگا۔ لیکن اس کی کیا گیارنٹی ہے کہ یہ جن جن ہاتھوں میں پہنچے گا وہ سب کے سب با وضو بھی ہوں گے!

۵۔ ہم نے اپنی عقیدت وارادت کے تحت اس کو خط میں لکھ دیا اور ہمارے ایک بے وضو بھائی نے اس کو چھو لیا تو ہم نے خواہ مخواہ سے اس کو معاصی کے ارتکاب میں پھانس دیا جو بے قصور تھا وہ اب قصوروار ٹھہرا۔ اور ایسا محض ہماری وجہ سے ہوا اس لیے اگر صرف 786 ہی لکھ دیا ہوتا یا باسمہ تعالیٰ پر اکتفاء کیا ہوتا تو یہ خرابی اور ارتکاب معاصی کی نوبت ہی کیوں آتی۔

غرض یہ اور ان جیسی دیگر خرابیوں اور بگاڑ کے وجود وظہور کے امکان پر نظر کرتے ہوئے ان سے احتراز وگریز کی خاطر علمائے دور بین وحق شناس نے اس میں عدد درجہ احتیاط برتا ہے۔۔۔ الفاظ ومعانی اور ان کی تحریر میں اہل زبان ورسم کا تتبع حرف آخر ہے۔ کسی بھی زبان کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اسی زبان میں اس کی رسم ملحوظ رہے۔ یہاں آپ نے جب "الرحمٰن" پر اپنا خلجان پیش کیا ہے تو یہ لازم تھا کہ اس کو تلفظ کی نگاہ سے ہٹ کر عربی زبان کی رسم کی نگاہ سے دیکھا ہوتا جس سے یقیناً آپ کا یہ خلجان کافور، نیست ونابود اور ہباءً منثورا بن کر رہ جاتا۔ یہ آج تک کسی نے بھی عبد الرحمان، فضل الرحمان اور حفظ الرحمان مع الف نہیں لکھا ہے بلکہ عبد الرحمٰن، فضل الرحمٰن اور حفظ الرحمٰن بغیر الف کے ہی لکھا ہے اور یہی ان کی اصلی رسم الخط ہے۔ لہٰذا یہاں حروف ابجد کے لحاظ سے ایک حرف الف اور ایک عدد کا فقدان لازمی ہوگا اور اس اعتبار سے بسم اللہ کی تعداد ۷۸۶ ہی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فقیر کی کتاب "رسم القرآن"۔

بقیہ "دورۂ کیرلہ" [ص 98 سے آگے]

معلوم ہوا۔ میں نے اردو میں تقریر کی تو لوگ اس طرح خاموش بیٹھے رہے گویا ان کو میری بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آرہی تھی۔ بعد میں میری تقریر کا اردو سے ملیالم میں ترجمہ کیا گیا۔

تقاریر کے سلسلہ کے بعد وہاں ذکر کی مجلس منعقد ہوئی۔ ذکر کے بعد تمام حاضرین سے یہ کہا گیا کہ ویلور سے نکل آگرہ میں سے ملاقات کریں اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ سب نے آکر ملاقات کی اور ان کے لیے تبرک کے طور پر کھانا اور کھجور دیا گیا۔ ملاقات کا یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا۔ لوگوں کی محبت والفت اور عقیدت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ہم لوگ جلسہ کے دوسرے دن بذریعہ کار شرنور تک آئے اور وہاں سے بذریعہ ریل ویلور لوٹ آئے۔

سادات کرام کے ساتھ ایسی محبت میں نے دوسرے صوبوں میں نہیں دیکھی اور یہاں دینی علم اور مذہبی جوش وخروش انتہا پر ہے اور مختلف مسلکوں اور جماعتوں کے افراد اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں میں باہمی اتحاد واتفاق بھی نظر آیا۔ اور ہمارے دورہ میں کوئی ناخوش گوار واقعہ دیکھنے کو نہیں ملا۔ اس سے میرے ذہن پر یہی تاثر ابھرا کہ یہاں کے لوگ اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے اچھے ہی ہیں۔ بقول سعدی علیہ الرحمہ ؎

ظاہرش عیب نمی بینم و باطنش غیب نمی دانم

شمالی آرکاٹ کا ایک روشن ستارہ !!

حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری عرف محی الدین ذوقی ویلوری

جاوید حبیب اردو لکچرار، اسلامک اکاڈمی ریس آئی ای ٹی کالج کامپلکس چینئی ۱۸

حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی کے فرزند حضرت مولانا غلام محی الدین سید شاہ عبداللطیف قادری (ثانی) ذوقی بمقام ویلور ۱۱۵۱ ہ م ۱738ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کی ہجری تاریخ کسی نے "رخ شاد" (۱۱۵۱ھ) سے نکالی ہے۔

حضرت ذوقی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے اور عربی صرف و نحو اور علم منقول و معقول محمد عظیم الدین دامادِ محمد جعفر سے حاصل کی۔ آپ بچپن ہی سے غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔

نواب غوث خان اعظم نے "تذکرہ گلزارِ اعظم" میں حضرت ذوقی کی تعلیم و ذہانت سے متعلق یوں لکھا ہے۔

" در اوائل حال کتب فارسیہ بخدمت والد ماجد خود گذرانیدن و بعد پیش عظیم الدین دامادِ جعفر طالب علم ویلوری تمامی نسخ صرف و نحو، رسائل علم معقول و منقول بسند رسانیز در اندک مدت از جودت طبع رسا و ذہن بعد ذکا بر مطالعہ جملہ کتب معتبر معقول و منقول و فروغ و اصول قدرت عظیمہ و ملکہ نامہ ساختہ[۱]

حضرت ذوقی نے ان علوم کے ساتھ ساتھ کشتی، تیر اندازی، شہ سواری میں بہت کم عمری ہی میں ملکہ حاصل کیا۔ سولہ (۱۶) سال کی عمر میں حافظ محمد حسین سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ پھر آپ اپنے والد سے "سکندر نامہ"، "مخزنِ اسرار"، "قران السعدین"، "تحفۃ العراقین" اور "قصائد خاقانی" وغیرہ کتابیں پڑھیں اور ان میں مہارت تامہ پیدا کرلی۔

حضرت قربی ویلوری سے اپنے دور کے جید عالم، صوفی اور پیر و مرشد حضرت شیخ ناصر (جن کا مزار مبارک رانی پیٹ کی ندی کے پہلو میں موجود ہے آج بھی جن کے کشف و کرامات کا سلسلہ جاری ہے) سے بڑے گہرے اور اچھے مراسم تھے۔ حضرت قربی اکثر موصوف سے ملاقات کے لیے رانی پیٹ (جو ویلور سے بائیس ۲۲ کلو میٹر پر واقع ہے) جاتے تھے۔ حضرت قربی کبھی کبھار اپنے ساتھ اپنے فرزند ذوقی کو بھی لے جاتے تھے۔ شیخ موصوف، ذوقی کے سر پر بڑی شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرتے اور یہ دعا دیتے تھے۔ " آپ ابا حضور کی طرح علم و فضل میں بہت بلند مرتبہ پاؤ گے "۔

آخرش شیخ ناصر کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی ۔ اور ذوقی نے ترقی کے منازل طے نہیں کئے بلکہ ہر منزل ان کے قدم چومتی رہی ۔ ع۲۵

آپ کے جامع الصفات شخصیت اور علم وفضل اور اعلیٰ مرتبہ کی نظیر دُور دُور تک نہیں ملتی تھی ۔ آپ نہ صرف زود گو شاعر تھے بلکہ اچھے نثر نگار بھی تھے ۔ لوگ آپ کو اپنے دور کا قطب تسلیم کرتے تھے ۔ زود نویسی میں آپ کا ہم پلّہ کوئی نہیں تھا ۔ موصوف نے اپنی فارسی مثنوی "معجز مصطفےٰ" ایک ماہ میں لکھی تھی ۔ جس کا ذکر مولانا عبدالحیٔ واعظ بنگوری نے بھی کیا ہے ۔ ع۲۶

حضرت ذوقی کے شاگرد حاجی محمد مہاجر عشرت نے "معجز مصطفےٰ" کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اپنے استاد کی وہبی صفات کی تصویر یوں کھینچی ہے : ؎

یہ کچھ زورِ طبع و ذکاوت نہیں ! — یہ قوت ولایت کا ہے بالیقین

مولانا عبدالحیٔ واعظ بنگوری نے مثنوی "مطلع النور" میں حضرت ذوقی کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے یوں نقشہ کھینچا ہے : ؎

جودتِ طبع جب تھی اس کی رسا — اور تھا تیز اس کا فہم و ذکاء
عربی معتبر کتب پہ تمام — ہوا حاوی بفضلِ ربّ انام
علم معقول اور فن منقول ! — اور علم فروع و اصول !
سب پہ قادر کیا اسے قادر — ہوا ہر فن میں وہ بڑا ماہر
اور تصوف کے سب رموز دقیق — اپنے والد سے کر چکا تحقیق !
اس کا کوئی سمجھ عدیل نہ تھا — کوئی اس ملک میں مثیل نہ تھا
بس اس فن میں وہ گرامی تھا — ثانیٔ جامی و نظامی تھا

حضرت ذوقی نہ صرف غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے ۔ بلکہ بہترین شاعر اور نثر نگار بھی تھے اور اپنے وقت کے قطب بھی مانے جاتے تھے ۔

حضرت ذوقی کے اخلاق و عادات اور صفات و کمالات کی نظیر اس دور میں خال خال ہی ملتی تھی ۔ طبیعت میں درویشانہ بے نیازی اور قلندرانہ شان کے جلوے نمایاں تھے ۔ توکل و استغنا کی کیفیت کا یہ عالم کہ کسی شہنشاہ کی عنایت کے بھی طالب نہ تھے ۔ جود و سخا کا جذبہ اتنی بلندی پہ تھا کہ کوئی غریب ان کے دروازے سے کبھی خالی نہیں گیا اور جو بھی طالب علم حصولِ علم کے لیے اُن کے پاس آتا تھا تو اُسے نہ صرف مفت تعلیم دیتے تھے بلکہ اس کے کھانے پینے اور رہائش کا بھی انتظام کرتے تھے ۔ حضرت ذوقی کی سخاوت کا اور توکل کا بیان حضرت عبدالحیٔ نے "مطلع النور" میں یوں کیا ہے ع۲۷ ؎

گرچہ تھا بے معاش ایسا یاں — پہ توکل میں تھا جلیل الشان
اور تھا بحر جود و کان و کرم — اور ابر نوال تھا ہر دم
سائلیں سے سمجھ کسی کو بھی — نہیں محروم وہ کیا ہے کبھی
نقد دو لک روپیہ سے بھی زیاد — سائلیں کو دیا وہ پاک نہاد
اس کی لنگر میں جانئے ہر روز — ہوتے تقسیم اے شرف اندوز
بس گزارا ہے یونہی عمر تمام — اس کا کافل سدا تھا رب انام

حضرت ذوقی کا محبوب مشغلہ تھا مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھنا اور اپنی پسندیدہ کتابوں کو نقل کرلیا کرتے تھے۔ آپ بہترین خطاط بھی تھے۔ آج بھی آپ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں کتب خانۂ مدرسۂ لطیفیہ میں موجود ہیں۔ "مثنوی معجز مصطفےٰ" کے آخری صفحات میں ان کتابوں کی فہرست ہے جنھیں حضرت ذوقی نے اپنے دست مبارک سے نقل کیا۔

حضرت ذوقی کی بدیہہ گوئی اور بیت بازی کا یہ عالم تھا کہ لمحوں میں مولانا باقر آگاہ کے مصرعوں پہ گرہ لگادیتے اور ان کی صحبتوں میں رہ کر کئی شعروں پہ تضمینیں لکھ دیتے تھے۔

حضرت ذوقی نے چالیس سال کی عمر پائی تھی لیکن اس مختصر عمر میں آپ نے کثیر التعداد میں معرکہ آرا کتابیں تصنیف کیں۔ یہ تمام تصانیف آپ کی خداداد صلاحیتوں کی غماز ہیں۔ آپ نے ۱۳؍ رجب المرجب ۱۱۹۹ھ مطابق 1786ء کو وفات پائی۔

حضرت ذوقی نے مولانا باقر آگاہ کی طرح کئی معرکہ آرا فارسی تصانیف ادب کو دیے۔ زیادہ تر تصانیف فارسی میں ہیں عربی اور اردو میں آپ کی تصانیف کم سہی لیکن ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اردو تصانیف میں "مثنوی عقائد نامہ"، "مثنوی غوث نامہ" بے حد مشہور ہیں۔ "مثنوی عقائد ذوقی" میں قرآنی آیتوں اور احادیث کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی عام لوگوں کو دینی مسائل سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی کل ایک سو نو (109) ابیات پر مشتمل ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوا ہے۔ ؎

ہے کروں بعد وصفِ خدا اور رسول — کہ جن کی اطاعت کریں سب قبول

اس میں بہت سارے احادیث کو دکنی زبان میں نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انشائے عقائدِ ذوقی" میں حضرت ذوقی نے جن عقائد کو فارسی میں پیش کیا تھا۔ انھیں عقائد کو مثنوی کا روپ دیا ہے۔ ؎

گئے تھے وہ معراج کو جاگ تھیچ — اپس تن سوں نیں اس سخن پیچ ہیچ
گگن کے اوپر ہو کو براق سوار — وہاں نے بھی جا جا جدھر کردگار

مثنوی کے آخر میں حضرت ذوقی نے اللہ تعالےٰ سے یوں التجا کی ہے: ؎

اگرچہ یہ بندہ گناہ گار ہے — تو غفار ہے ہور ستّار ہے
الٰہی تو ذوقیؔ کو ایمان دے — اپس ذات کا اس کو عرفان دے
بھکاری ہے تیرا کر اس پر عطا — بحق محمدؐ نبی مصطفیٰؐ [4]

"مثنوی غوث نامہ" حضرت غوث الاعظم دستگیرؒ کی مدح اور ان کی کشف و کرامات کا مظہر ہے۔ یہ مثنوی چار سو پانچ (405) ابیات پر پھیلی ہوئی ہے [5]۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت ذوقیؔ کو حضرت غوث الاعظم دستگیرؒ سے بے حد محبت اور عقیدت تھی۔ کہیں کہیں حضرت ذوقیؔ کو جذبۂ عقیدت کی اڑانیں اپنی معراج کو چھو گئی ہیں۔ حضرت ذوقیؔ نے یہ مثنوی ۱۱۸۹ھ میں لکھی تھی۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانۂ لطیفیہ میں موجود ہے۔ جس کے بہت سارے اوراق کرم خوردہ ہوگئے ہیں۔ مثنوی کے ابتدائی صفحات اور درمیانی صفحات کے الفاظ مٹے مٹے سے ہیں۔ جس کی وجہ سے پڑھنا دشوار ہے۔ حضرت ذوقیؔ نے یہ مثنوی ٹھیٹ دکنی زبان میں رقم کی ہے۔ لیکن شعروں میں سلاست اور روانی بلا کی ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ مثنوی دکنی ادب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت ذوقیؔ نے ایک دکنی قصیدہ بھی لکھا تھا جو تریسٹھ (63) ابیات پر مشتمل ہے [6]۔ اردو شعر و ادب میں بہت سارے قصائد لکھے گئے ہیں۔ جن میں سوداؔ اور مومنؔ کے قصیدے بہت مشہور ہیں۔ لیکن حضرت ذوقیؔ کا یہ قصیدہ ان قصائد سے مختلف ہے۔ اسے حضرت ذوقیؔ نے اپنے پیر و مرشد کی مدح میں لکھا ہے۔ اس میں حضرت ذوقیؔ نے اپنے ممدوح کی عظمت و بزرگی، تبحرِ علمی، فیوض و برکات کا ذکر بڑے خلوص اور فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔

حضرت ذوقیؔ کے قصیدے کی زبان قدیم ہے اور فکر و خیال، اظہار و بیان کی خوبیوں سے معمور ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال برمحل ہے۔ قصیدے میں جو شعریت ہے اور زورِ بیان کی کرنیں پھوٹی ہیں وہ حضرت ذوقیؔ کی علمی اور فنّی شخصیت کو بہت اونچا اٹھاتی ہے۔

حواشی

[1] تذکرۂ گلزارِ اعظم: نواب غلام غوث خان اعظم: ص ۱۹۱

[2] اقطابِ ویلور: سید طیب الدین اشرفی: مطبوعہ ۱۳۸۳ھ م 1963ء

[3] خانوادۂ قرنی کی علمی و ادبی خدمات: ڈاکٹر ذاکرہ ام شہلا: (غیر مطبوعہ) مقالہ برائے پی ایچ ڈی؛

[4] مثنوی مطلع النور: ص: ۱۳ [5] قطب ویلورؒ: مولانا بشیر الحق قریشی: مطبوعہ ۱۴۰۹ھ 1989ء

[6] کتب خانۂ مدرسۂ لطیفیہ ویلور اور مدرسۂ محمدی مدراس میں موجود ہے۔

[7] اس مثنوی کا ایک نسخہ مدرسۂ لطیفیہ ویلور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

[8] اس مثنوی کا ایک نسخہ مدرسۂ لطیفیہ، ویلور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔



ھجری اور ھجرت

مولوی محمد اقبال لطیفی۔ تروناملئے

دنیا کی تاریخ میں جو حیثیت تاریخ اسلام کو حاصل ہے وہ کسی اور تاریخ کو حاصل نہیں ہے۔ جس پہلو سے بھی تواریخ کا جائزہ لیا جائے تو ہر پہلو سے آپ کو اسلامی تاریخ کے ایک نمونہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔

دنیا کے ہر ملک والے اور ہر مذہب والے اپنے لیے ایک سال مقرر کر لئے ہیں۔ مثلاً عیسوی سال، (تمل علاقوں میں) ترودلّور سال، تیلگو سال آندھرا میں اسی طرح اہل اسلام نے بھی اپنے لیے ہجری سال مقرر کر لیا ہے۔

دُنیا کی ہر قوم اپنے سالوں کو کسی نہ کسی سبب کو بنیاد بنا کر اس کا نام تجویز کرتی ہے۔ مگر مسلمانوں نے سال کا اول و آخر ایثار و قربانی کو بنیاد قرار دیا ہے۔ سال کا آخری مہینہ یعنی ماہ ذی الحجہ سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح سال کا پہلا مہینہ یعنی ماہ محرم، یزید کی ظالمانہ حکومت کے خلاف اپنی جان دینے والے امام حسین رضی اللہ عنہٗ کی قربانی کو یاد دلاتا ہے۔

ھجرت

ہجرت کا معنیٰ عربی زبان میں ناپسند کرنا، قطع رحمی کرنا، صبح سویرے چلنا۔ لوگوں سے تنگ آکر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف کوچ کر لینا وغیرہ۔

نبیٔ کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر جب کفّارِ مکہ کی زیادتی حد سے بڑھ گئی تو خدا کے حکم سے اپنے جگری دوست حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ کی طرف تشریف لے گئے اور آپ کی اتباع میں بے شمار صحابہ نے مکہ چھوڑا اور مدینہ تشریف لے گئے۔ اسی واقعہ کو ہجرت کہا جاتا ہے۔

یومِ ھجرت

حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی ترپن (۵۳) سال کی عمر میں ماہ ربیع الاول یعنی 28، ماہِ جون چھ سو بائیس 622ء عیسوی بروز جمعرات، صبح سویرے ہجرت کے ارادے سے نکلے۔ بارہ (۱۲) ربیع الاول بوقتِ ظہر مدینہ کے قریب شمالی جانب میں بستا نامی ایک مقام

یہ آپ (صلے اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے والے ایک عمر رسیدہ (جنھوں نے آپ کو دیکھے بغیر ایمان لایا تھا، جن کا نام کلثوم ابن حطم بتایا جاتا ہے۔) کے گھر میں چار دن ٹھہرے رہے۔ دورانِ قیام میں خدا کی عبادت کے لیے آپ نے ایک مسجد بنائی جو تقویٰ کی بنیاد پر بنائی جانے والی سب سے پہلی مسجد ہے۔ جو مسجدِ قباء کے نام سے معروف ہے۔ بقول بعض تاریخ نگاروں کے آپ نے اس مسجد کو پورے چودہ (۱۴) دنوں میں مکمل کیا تھا۔ اس درمیان مکہ کے بہت سارے مسلمان ہجرت کرکے آپ کے پاس آپہنچے۔ اس کے بعد پانچویں دن (ایک دوسری روایت کے مطابق پندرھویں (۱۵) دن) بروز جمعہ صبح سویرے مدینہ کا رُخ کیا۔ راستہ میں نمازِ جمعہ کا وقت آگیا تو بطن وادی نامی جگہ (جہاں قبیلۂ بنو سلمیٰ کے لوگ بستے تھے۔) وہاں کی ایک مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد مدینہ جا پہنچے۔ آپ نے جو سب سے پہلے خطبہ دے کر نمازِ جمعہ ادا کیا وہ یہی مسجد ہے۔ اس دن آپ کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کرنے والے افراد سو (۱۰۰) تھے۔

پہلے خطبہ کا خلاصہ

سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہیں۔ میں حمد و ستائش کرتا ہوں اور اسی سے استغفار کرتا ہوں اسی سے رہبری چاہتا ہوں۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں میں (محمدؐ) اللہ کا پسندیدہ اور اس کا رسول ہونے کی گواہی دیتا ہوں۔

بوجہ ایک عرصہ تک انبیاء علیہم السلام کے تشریف نہ لانے کے لوگ راہِ راست سے بھٹک کر ظلم و زیادتی کرنے لگے۔ اس قیامت انگیز دور میں اللہ نے مجھے ایک بہتر رہبر اور ہادی بنا کر دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے لہٰذا تقویٰ کو مضبوطی سے تھام لو۔ خدا کے حکم کے خلاف نہ کرو اور تم لوگ اللہ کے ساتھ بہتر طریقہ سے پیش آؤ، جس طرح وہ تمہارے ساتھ پیش آتا ہے۔ اور اللہ کے دشمنوں سے دور رہو۔ خدا کی راہ میں حق کے ساتھ محنت کرو۔ اس لیے کہ تم کو نجات دینے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔

سنِ ہجری

حضرت ابو موسیٰ الاشعری کو (جو بصریٰ کے گورنر تھے۔) حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے ایک خط بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے بھی خط روانہ کیا۔ اس میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ: یا امیر المومنین آپ کے مکتوب میں علیسوی یا عام الفیل کی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ لہٰذا میری یہ درخواست ہے کہ آئندہ مکتوبات میں ضرور کسی سال کا اعتبار کرتے ہوئے تاریخ درج فرمائیں تاکہ آپ کے احکام صدور اور منسوخ کو اچھی طرح سمجھا جاسکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے اس جوابی خط کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ ہمارے لیے کوئی نہ کوئی سال مقرر ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ کون سا سال اپنے لیے تجویز کرلیا جائے اور اس کا نام کیا رکھا جائے۔ تو بعض صحابہ نے کہا کہ نبوت کی یاد دہانی کے لیے اس کا نام نبوی ہونا چاہیے۔ بعض نے آپ کی پیدائش کی یاد کے لیے اس کا نام میلادی ہونے کو پسند کیا۔ اور بعض نے ہجرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہجری کا نام لیا۔

حضرت عمرؓ کی رائے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا فرقان کی حیثیت چوں کہ ہجرت کو حاصل ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور تاریخ نبوت میں اختلاف ہے اور آپ کی وفات کی طرف نسبت کرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا اس سال کے نام کو ہجرت ہی کی طرف منسوب کرنا بہتر اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غرض متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سال کو ہجری کا نام دیا جائے۔ چناں چہ اسی وقت سے اسلامی سال کا نام ھجری رکھا گیا۔ پھر جب سال کا پہلا مہینہ مقرر کرنے کی باری آئی تو کسی نے کہا کہ سال کا پہلا مہینہ رمضان المبارک بنا رکھا جائے، کسی نے ربیع الاول کی رائے دی۔ آخر سب کے اتفاق سے ماہ محرم سال کا پہلا مہینہ قرار پایا۔ کیوں کہ ماہ محرم الحرام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بے مثال اور بے انتہا تاریخی واقعات اور قربانیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اتنا ہی نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مدینہ سے جو عہد (بیعت عقبیٰ) لیا تھا وہ ماہ ذی الحجہ میں پیش آیا۔ اور اس کے بعد مدینہ منورہ کی ہجرت کا عہد جو کیا (بیعت ہجرت) وہ بھی ماہ محرم الحرام ہی میں پیش آیا تھا۔ ان ہی سب وجوہات کی بناء پر ہجری اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم الحرام سے ہونا طے پایا۔

بقیہ صـ72 کا "جواھر الحقائق" •

نباتات، جمادات، روح و جسم، ذات و صفت، نور اور سایہ، پنجرہ اور تصویر، ستون و دیوار یہ سب کے سب پورے مخلوقات ہیں۔

پھر سوچو، غور کرو) پوچھنے والی مخلوق کو خالق و پروردگار کے ساتھ جو اصل میں لائق پرستار ہے۔ کیا نسبت ہے؟ اور ان گمراہوں اور راہ بھٹکوں کو راہبروں اور راہروؤں (صراط مستقیم پر چلنے والوں) سے کیا تعلق ہے؟ اور ان باطل کردوں) اور تاریک اندھیروں میں رہنے والوں کو نورانیوں اور نور والوں کے ساتھ کیسا جوڑ ہو سکتا ہے؟؟؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟ (ایک ادنیٰ اور حقیر) خاک کو پاک عالم کے ساتھ کس طرح جوڑ اور تعلق ہوگا؟ نجانا اللہ وایاھم عن الضلال وھدانا الی معارج الکمال۔ (اللہ نے ہمیں ان گمراہیوں سے نجات بخشے خدا کرے کہ انھیں بھی نجات حاصل ہو۔ اور ہمیں ہدایت بھی دی تو کمالِ عروج کی ہدایت دی)

الحمد للہ والمنتہ۔ یہاں تک فائدہ نمبر پانچ کا مکمل ترجمہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ (جاری ہے)

بقیہ صـ119 کا "مدارس عربیہ اور عصری تقاضے"

کارروائیوں کا جواب دے سکتے ہیں ورنہ وہ لوگ جو کماحقہٗ اسلام سے واقف نہیں ہوتے، لیکن عصری تعلیم سے مزین ہوتے ہیں، ایسے احباب INTERNET اور عالمی صحافتی سازشوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ کالج اور یونیورسٹیاں صحیح معنوں میں علماء کو پیدا نہیں کر سکتے اور اگر مدارس کے فارغین چند علوم جدیدہ سے واقف ہو جائیں تو وہ امت کی کامل قیادت کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اور ان کو بہتر معاشی وسائل کے حصول کے مواقع فراہم ہو جائیں گے۔ مدارسِ عربیہ امت کی قیادت و سیادت کے مراکز کی حیثیت سے تشکیل کرنے کی سعی فرمائیں۔ یہ ایک مستحسن قدم ہوگا اور نتیجتاً امت کی تشکیلِ نو ہو گی اور امت پھر اپنی منزل کے راستہ پر گامزن ہو جائے گی۔ ••

من لا شیخ لہ فالشیطان شیخہ

"جس شخص کا کوئی ہادی و رہبر نہ ہو تو شیطان اس کا مرشد ہو جاتا ہے"

عبد السّلام لطیفی۔ ویلوری

مبارک ہیں وہ لوگ جو دنیاوی عیش و راحت پر آخرت کی ابدی و سرمدی زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے اس کو عمدہ اور بہتر بنانے کے لیے اپنے تمام تر وسائل و ذرائع کو لگا دیتے ہیں، جن کو ہمیشہ حصولِ مقصد کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ عبادتوں، ریاضتوں، مجاہدوں اور محاسبوں کے ساتھ عالمِ شریعت و شیخِ طریقت کا وسیلہ پاکر برسوں کے مراحل لمحوں میں طے کر لیتے ہیں اور انھیں صحبتِ شیخ کی برکت سے آن کی آن میں منزلِ مقصود مل جاتی ہے۔ لہذا جو خوش نصیب یہ چاہتے ہیں کہ زمین کی پستیوں سے اٹھ کر عرش کی وسعتوں میں پہنچ جائیں۔ ناسوت کی کثافتوں سے نکل کر ملکوت کی لطافتوں میں چلے آئیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ محبوبِ حقیقی کے وصل کی لذّتوں سے سرشار ہو کر حیاتِ جاودانی حاصل کر لیں۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ شریعت غرّہ پر عمل پیرا ہو کر بھرپور عقیدت و محبت کے ساتھ کسی مردِ کامل، صاحبِ علم و تقویٰ کی صحبت اختیار کرتے ہوئے اس کے دستِ حق پرست پر بیعت کریں۔

تحقیقِ بیعت

بیعت کے لغوی معنی ہیں اتباع کرنا، خرید و فروخت کرنا، کسی کا مرید ہونا۔ جیساکہ قاموس غیاث اللغت وبہارِ عجم وغیرہ میں ہے۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی، شرح مشکوٰۃ شریف میں فرماتے ہیں کہ بیعت بیع سے مشتق ہے۔ جس نے بیعت کی گویا اس نے اپنی ذات کو اپنے پورے ارادے کے ساتھ مرشد کے ہاتھ میں فروخت کر ڈالا۔ کامل ارادہ ایک عجیب چیز ہے کہ کوئی شئے کما حقہٗ اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی اگر ارادہ ہو تو ایک ذرّہ بھی پردۂ غیب سے ظہور میں نہیں آتا۔

بیعت قربِ حق کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے اور یہ مسئلہ اصولِ اسلام یعنی قرآن حدیث اور اجماعِ امّت سے بالاتفاق ثابت ہے۔ قرآن ناطق ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْرِقْنَ وَ لَا يَزْنِيْنَ وَ لَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(قد سمع اللہ : سورۂ ممتحنہ، رکوع:۲)

ترجمہ : اے نبیؐ جب تمہارے حضور میں مسلمان عورتیں حاضر ہوں اس پہ بیعت کرے کہ اللہ کا کچھ شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ چوری کریں اور نہ بدکاری کریں اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں اور نہ وہ بہتان لائیں اور احکامات میں آپ کی نافرمانی نہ کرنے کا عہد کرالیں تو آپ ان سے بیعت لیجیے اور اللہ کے پاس ان کی مغفرت چاہیے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔

نیز احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے ارکانِ اسلام جیسے نماز، روزہ حج اور زکوٰۃ ادا کرنے اور کافروں کے ساتھ جنگ کی سختیوں میں ثابت قدم رہنے اور سنّت کو مضبوطی سے تھامنے اور بدعت سے احتراز کرنے اور ہجرت اور جہاد کرنے کی بیعت لی ہے تو اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ بیعت لینا، بیعت کرنا اور اس پہ ثابت قدم رہنا نصِ قطعی سے بھی ثابت ہے۔

ضرورت و اہمیت شیخ

بہت سے لوگ ریاضتوں سے خدا تک پہنچتے ہیں لیکن جو فائدہ مرشدوں کی صحبت اور تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اس اندر صحبت کے اور درستگی اور خیر و نعمت کا عنصر ہوتا ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ 'روحِ تصوّف' میں ایک حدیث بیان فرماتے ہیں، جس کو امام غزالیؒ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ : الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ : شیخ اپنی قوم میں ایسا ہی ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں۔ مشائخ کاملین جو حقیقتاً وارث انبیاء ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے کسبِ فیض میں اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں۔ ان کی حیثیت برزخ کی ہے، جن کے ذریعہ سے کمال حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بغیر مطلوبِ حقیقی کو پانا ممکن نہیں۔ حضرت امام غزالیؒ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مرید کے لیے ایک شیخ اور استاد کی نہایت ضرورت ہے۔ جس کی اقتداء کرے اور شیخ اس کی رہنمائی کرے، کیوں کہ دین کی راہ باریک اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف شیطان کی راہیں بے حساب اور واضح ہوتی ہیں۔ جس آدمی کا کوئی شیخ نہیں جو اسے سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے تو شیطان اس کو اپنے راستوں پہ کھینچ لاتا ہے۔ حضرت محبوب سبحانی سید شاہ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کا ارشادِ گرامی ہے : جس کا کوئی پیر نہیں شیطان اس کا پیر ہے۔ اور حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کا فرمان ہے : من لم یکن لہٗ استاذ فامامہ الشیطٰن : جس کا کوئی استاد و مرشد نہیں اس کا امام شیطان ہے۔

حضرت ابن ماجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے روایت ہے : من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃً جاھلیۃ : جس نے اس حالت میں جان دی کہ اس کی گردن میں بیعت کا ہار نہیں تھا وہ زمانۂ جاہلیت کی موت مرا۔ کوئی انسان لاکھ علوم کو جمع کرے اور مختلف طبقات کے لوگوں کی صحبت میں رہے مگر وہ کسی شیخ کامل، امام مصلح اور

عالم باعمل کی تربیت میں رہ کر مجاہدہ و ریاضت کئے بغیر خاصانِ خدا کے مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس بات کی صداقت اس واقعہ سے ہوجائے گی۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر علیہ الرحمہ چھتیس سال تک ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ کو آپ کی عبادت پسند آگئی۔ آپ سے فرمایا: اے فرید! میں نے تم کو کن فیکون عطا کیا۔ حضرت نے عرض کیا: اے رب تعالیٰ مجھے کن فیکون نہیں چاہیے۔ بلکہ تیرا قرب مقصود ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم کو میرا قرب درکار ہے تو پیرِ کامل کو تلاش کرو اس کے بغیر مجھ کو نہیں پاسکتے۔ لہٰذا آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہوکر واصل بحق ہوئے۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: جب تک تم اپنے معاملات کو کسی برگزیدہ شخصیت کے حکم پر عمل نہ کروگے ساری عمر مجاہدہ و ریاضت میں لگا دینے کے باوجود حرص و ہوا کے جال سے نکل نہیں سکتے اگر تمہیں کوئی ایسی برگزیدہ شخصیت مل جائے، جس کی تعظیم و تکریم کی طرف دل خود بخود مائل ہونے لگے تو اس کی خدمت کو لازم کرلو اور خود کو اس کے سپرد اس طرح کردو جیسا کہ میّت غسّال کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ شیخ جس طرح چاہے تم پر تصرف کرے۔ ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے۔ شیخ کی تعلیم و تربیت اور صحبت کی وجہ سے نفس امّارہ اپنی امّارگی چھوڑ کر تقویٰ و طہارت سے آراستہ ہوجاتا ہے۔ شیخ کی مثال چاند کی سی ہے جو سورج سے روشنی لیتا ہے اور دنیا کو منوّر کرتا ہے۔ اسی طرح شیخ کامل فیاض سے فیض یاب ہوکر اپنے مریدوں پر فیضانِ عام کرتا ہے۔ جس سے اُن کے دلوں میں عشق الٰہی کی چنگاریاں دہک اٹھتی ہیں اور انھیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوتی ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب سامنے قرآن مجید و احادیث پاک اور کتبِ فقہ موجود ہیں تو پھر کسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بے شک یہ تمام چیزیں تو ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کے معانی و مطالب استاد کے بغیر بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ جواب نفی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ جب ان ظاہری معانی و مطالب استاد کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتے تو بھلا ان کے اسرار و نکات بلا استاد کے کیسے معلوم ہوسکتے ہیں۔ ان کے اسرار و دقائق بیان کرنے والے استاد ہی کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں شیخ کہتے ہیں۔

اللہ کی خاص معرفت جو سینہ بہ سینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت کے اولیا اللہ تک پہنچتی ہے یہ علم و حکمت و معرفت اللہ والوں کی خدمت میں رہ کر ان کے سینوں سے حاصل ہوتی ہے صحیفوں اور کتابوں سے نہیں اور معرفت کے حاصل کرنے کی جگہ بس یہی دُنیا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اکابرین امّت کی اقتدا و پیروی کرتے ہوئے کسی ایک سلسلہ سے وابستہ ہوکر فیض یاب ہوجائیں: ؎

جب تک نہ لوگے آسرا اولیاء اللہ کا
سخت مشکل ہے پتہ ملنا رسول اللہ کا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام کو بیعت جیسی نعمت عظمیٰ سے مشرف و مکرم فرمائے۔ آمین!

بجاہ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین ●●●



أدلة التبرك بآثار الرسول صلى الله عليه وسلم

إعداد: كے. محمّد شفيق لطيفي. مالا برام. كـيوالا

بسم الله الرحمٰن الرحيم. الحمد لله مالك البركة والصلوة والسلام على نبيّه المبارك وعلى آله وأصحابه وأتباعه الذين هم تعنّتوا لحصول بركاته. أمّا بعد.

التبرك بالشيئ هو طلب الفوز والسعادة ورجاء الرحمة والنعمة ورغبة الخير والشفاء من الله تعالى بملابسته وبمحبته. فالتبرك أمر مطلوب فى الدين لذٰلك كانت الصحابة ومن بعدهم من التابعين وغيرهم يعظّمون الآثار ويأخذون منها البركات من الرسول الذى هو صاحب البشارات ومن الصالحين الذين هم أُولوا الدرجات وأدلتها واضحة فى كتب الأحاديث ولنورد بعضا منها.

التبرك بوضوئه صلى الله عليه وسلّم

عن أبي جحيفة قال خرج علينا النبيّ صلى الله عليه وسلم بالهاجرة فأُتي بوضوء فتوضأ فجعل الناس يأخذون من فضل وضوئه فيتمسحون به. (بخارى: ص ۳۱: ج ۱: باب إستعمال فضل وضوء الناس)

قال ابو موسى دعا النبي صلى الله عليه وسلم بقدح فيه ماء فغسل يديه ووجهه فيه ومجّ فيه ثم قال لهما: اى لأبي موسى ولبلال اشربا منه وافرغا على وجوهكما ونحوركما. (بخارى: ۳۱:۱)

عن عون بن أبي جحيفة عن أبيه قال أتيت النبي صلى الله عليه وسلم بمكة وهو بالأبطح فى قبة له حمراء من أدم قال فخرج بلال بوضوئه فمن نائل وناضح قال فخرج النبي عليه حلة حمراء. (مسلم: ۱۹۵: ۱: باب: سترة المصلى)

قال الامام النووي رح حول هذا الحديث: فتوضأ فمن نائل بعد ذلك وناضح تبركا بآثاره صلى الله عليه وسلم (شرح مسلم: ۱۹۶:۱)

حدثنى عون بن أبي جحيفة ان أباه رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى قبة حمراء من أدم ورأيت بلالا أخرج وضوء فرأيت الناس يبتدرون ذلك الوضوء فمن أصاب منه شيئا تمسّح به ومن لم يصب منه أخذ من بلل يد صاحبه (مسلم: ۱۹۶: ۱)

وقال عروة عن المسور وغیرہ یصدق کل واحد منهما صاحبه وإذا توضأ النبيّ کادوا یقتتلون علی وضوئه صلی الله علیه وسلم (بخاری: ۳۱ : ۱)

عن الجعد قال سمعت السائب بن الیزید یقول ذهبت بی خالتی إلی النبيّ صلی الله علیه وسلم فقالت یارسول الله! إن ابن أختی وقع فمسح رأسی ودعالی بالبرکة ثم توضأ فشربت من وضوئه (بخاری: ۳۱ : ۱)

عن محمّد بن المنکدر قال سمعت جابرا یقول جاء رسول الله صلی الله علیه وسلم یعودنی وأنا مریض لا أعقل فتوضأ وصبّ عليّ من وضوئه فعقلت...... (بخاری: ۳۲ : ۱)

التبرك بیدہ صلی الله علیه وسلم

عن انس بن مالك رضی الله عنه قال کان رسول الله علیه وسلم إذا صلی الغداة جاء خدم المدینة بآنیتهم فیها الماء فما یؤتی بإناء إلا غمس یدہ فیها وربّما جاء فی الغداة الباردة۔

(مسلم: ۲۵۶ : ۲: باب قربه صلی الله علیه وسلم من الناس)

قال النوویؒ فیه التبرك بآثار الصالحین وبیان ما کانت الصحابة علیه من التبرك بآثارہ صلی الله علیه وسلم وتبرکهم بإدخال یدہ الکریمة فی الآنیة : (شرح مسلم: ۲۵۶ : ۲)

قال الطیبی حول هذہ الحدیث: لیتبرکوا بإدخال یدہ الکریمة فی أوانیهم۔

(شرح الطیبی : ۳۲ : ۱۱ : باب فی أخلاقه وشمائله صلی الله علیه وسلم)

عن صفیة بنت مجزأة ان أبا محذورة کانت له قصة فی مقدم رأسه إذا قعد أرسلها فتبلغ الأرض فقالوا له الا تحلقها فقال إن رسول الله صلی الله علیه وسلم مسح علیها بیدہ فلم أکن لأحلقها حتی أموت (مجمع الزوائد ۵۱۸ : ۳)

التبرك بعرقه صلی الله علیه وسلم

عن انس بن مالك رضی الله عنه ان أم سلیم کانت تبسط للنبيّ نطعا فیقیل عندها علی ذلك النطع قال إذا نام النبي صلی الله علیه وسلم أخذت من عرقه وشعرہ فجمعته فی قارورة ثم جمعته فی سك وهو نائم قال فلما حضر أنس بن مالك الوفاة أوصی إلی أن یجعل فی حنوطه من السك قال فجعل فی حنوطه۔ (بخاری: ۹۲۹ : ۲: کتاب الاستئذان)

عن أنس بن مالك رضی الله عنه دخل علینا النبي صلی الله علیه وسلم وجائت أمّي بقارورة فجعلت تسلت العرق فیها فاستیقظ فقال یا أم سلیم ما هذا الذی تصنعین قالت

هذا عرقك نجعله فی طیبنا وهو من أطیب الطیب نرجوا برکته لصبیاننا فقال أصبت۔
(مسلم: ۲:۲۵۷ ؛ باب طیب عرقه صلی الله علیه وسلم، تاریخ دمشق: ۴:۱۴۷۰۴۷)

عن أنس رضی الله عنه قال کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یأتی فی بیت أم سلیم فینام علی فراشها ولیست أم سلیم فی بیتها فتأتی فتجده نائما وکان علیه الصلوة والسلام إذا نام ذق عرقه فتأخذ عرقه بقطنة فی قارورة فتجعلها فی مسکها۔ (مسند احمد: ۳:۲۳۰)

التبرك بدمه صلی الله علیه وسلم

عن عامر بن عبد الله بن الزبیر یحدث أن أباه حدثه انه أتی النبی صلی الله علیه وسلم وهو یحتجم فلما فرغ قال یا عبد الله إذهب بهذا الدم فأهرقه حیث لا یراك أحد فلما برز عن رسول الله عمد إلی الدم فشربه فلما رجع قال یا عبد الله ما صنعت بالدم؟ قال جعلته فی أخفی مکان علمت انه یخفی علی الناس۔ قال لعلك شربته؟ قال نعم قال ولم شربت الدم ویل للناس منك و ویل لك من الناس۔ قال أبو عاصم فکانوا یرون أن القوة التی به من ذلك الدم۔
(الإصابة فی تمییز الصحابة: ۴:۲، المستدرك ۳:۵۵۴: کتاب معرفة الصحابة)

التبرك ببلغمه صلی الله علیه وسلم

یؤید ذلك قول عروة قال أی قوم والله لقد وفدت علی الملوك ووفدت علی قیصر وکسریٰ والنجاشی والله إن رأیت ملکا قط یعظمه أصحابه ما یعظم أصحاب محمد محمداً والله إن تنخم نخامة إلا وقعت فی کف رجل منهم فدلك بها وجهه وجلده وإذا أمرهم إبتدروا أمره وإذا توضأ کادوا یقتتلون علی وضوئه۔ (بخاری: ۱:۳۷۹: باب الشروط فی الجهاد)

التبرك ببوله صلی الله علیه وسلم

عن حلیمة بنت أمیة عن أمها أمیمة بنت رقیقة قالت کان للنبی صلی الله علیه وسلم قدح من عیدان یبول فیه یضعه تحت السریر فجاءت إمرأة إسمها برکة فشربته فطلبه فلم یجده فقیل شربته برکة فقال لقد احتظرت من النار بحظار۔
(أسد الغابة: ۵:۴۰۳)

التبرك بالأماکن التی تعلق بها صلی الله علیه وسلم

عن عتبان بن مالك رضی الله عنه وهو من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم ممن شهد بدراً من الانصار انه أتی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یا رسول الله

قد أنكرت بصري وأنا أصلي لقومي فإذا كانت الأمطار سال الوادي الذي بيني وبينهم لم أستطع أن آتي مسجدهم فأصلي بهم ووددت يارسول الله أنك تأتيني فتصلي في بيتي فأتخذه مصلى فقال له رسول الله سأفعل إن شاء الله قال عتبان فغدا رسول الله فأذنت له فلم يجلس حتى دخل البيت ثم قال أين تحب أن أصلي من بيتك قال فأشرت له إلى ناحية من البيت فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فكبر فقمنا فصففنا فصلى ركعتين ثم سلم۔

(بخاری: ۶۰: ۱: باب المساجد فی البیوت : مسلم: ۴۶/۱)

قال حافظ ابن حجر العسقلانیؒ وفيه التبرك بالمواضع التي صلى فيها النبي صلى الله عليه وسلم أو وطئها۔ (فتح الباری: ۵۲۲: ۱)

وقال النوویؒ : ای موضعا أجعل صلاتي فيه متبركا بآثارك۔

(شرح مسلم: ۴۷: ۱)

عن ابی بردۃ قال قدمت مدينة فلقيني عبد الله سلام فقال لي انطلق الى المنزل فأسقيك في قدح شرب فيه رسول الله صلى الله عليه وسلم وتصلي في مسجد صلى فيه النبي صلى الله عليه وسلم فانطلقت معه فاسقاني سويقا وأطعمني تمرا وصليت في مسجده۔

(بخاری: ۱۰۹۱: ۲: کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

فیہ التبرك بآثار الصالحين :

قال موسى بن عقبة، رأيت سالم بن عبد الله يتحرى أماكن من الطريق فيصلي فيها ويحدث أن أباه وكان يصلي فيها وانه رأى النبي صلى الله عليه وسلم يصلي في تلك الأمكنة۔

(بخاری: ۷۰: ۱: باب المساجد التي على طرق المدينة)

قال الحافظ فی بیان هذا الحديث ومحصل ذلك ان ابن عمر كان يتبرك بتلك الأماكن

(فتح الباری)

التبرک بثوبہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن ام عطية قالت توفيت إبنة النبي صلى الله عليه وسلم فقال لنا اغسلنها ثلاثا أو خمسا أو أكثر من ذلك إن رأيتن فإذا فرغتن فآذنني فلما فرغنا آذناه فنزع من حقوه إزاره وقال اشعرنها إياه

(بخاری: ۱۶۸: ۱: هل تكفن المرأة في إزار الرجل)

قال العسقلانی : وهو أصل في التبرك بآثار الصالحين۔ (فتح الباری: ۱۲۹: ۳)

صلی اللہ علیہ وسلم وابوبکر حین ارتفع النہار فاستأذن رسول اللہ

عن أسماء بنت ابی بکر أنها أخرجت جبة طيا لسة كسروانية لها لبنة ديباج وفرجيها مكفوفين بالديباج فقالت هذه كانت عن عائشة حتى قبضت فلما قبضت قبضتها وكان النبي صلى الله عليه وسلم يلبسها فنحن نغسلها للمرضى نستشفى بها ۔

(مسلم، ۲:۱۹۰ ؛ وایضاً طبقات الکبری لابن سعد : ۴۵۴ : ۱)

عن عبد الله بن عمر أن عبد الله بن أبي لما توفي جاء ابنه الى النبي صلى الله عليه وسلم فقال أعطني قميصك أكفنه فيه وصل عليه واستغفرله فأعطاه قميصه .....

(بخاری: ۱۶۹: ۱ : باب الکفن فی قمیص، ترمذی: ۱۳۶/۲ أبواب التفسير)

قال حافظ ابن حجر العسقلانی رح : يؤخذ من هذا التبرك بآثار الصالحين سواء علمنا انه مؤثر فى حال الميت أولا ۔ (فتح الباری: ۱۳۹ : ۳)

عن سهل ان إمرأة جائت النبي ببردة منسوجة فيها حاشيتها أتدرون ما البردة قالوا الشملة قال قالت نسجتها بيدى فجئت لأكسوكها فأخذها النبى محتاجا إليها فخرج إلينا وإنها إزاره فحسنها فلان فقال اكسنيها ما أحسنها فقال القوم ما أحسنت لبسها النبى صلى الله عليه وسلم محتاجا إليها ثم سألته وعلمت انه لايرد قال إنى والله ما سألته لألبسه وإنما سألته لتكون كفنى قال سهل فكانت كفنه

(بخاری: ۱۷۰ : ۱ : باب من استعد الكفن فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم)

قال الحافظ : وفيه التبرك بآثار الصالحين (فتح الباری: ۱۴۴ : ۳)

التبرك بشعره صلى الله عليه وسلم

عن ابن سيرين قال قلت لعبيدة عندنا من شعر النبي صلى الله عليه وسلم أصبناه من قبل أنس أومن قبل أهل أنس فقال لأن تكون عندى شعرة منه أحب إلى من الدنيا وما فيها

(بخاری : ۲۹ : ۱ : باب الماء الذى يغسل به شعر الإنسان)

وفى رواية ، لأن يكون عندى منه شعرة أحب إلى من كل صفراء وبيضاء على ظهر الأرض ۔ (طبقات الکبری : ۹۵ : ۶)

عن أنس بن مالك رضى الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم أتى منا فأتى الجمرة فرمها ثم أتى منزله بمنى ونحر ثم قال للحلاق خذ وأشار إلى جانبه الأيمن ثم الأيسر ثم جعل يعطيه الناس ۔ (مسلم : ۴۲۱ : ۱ : باب بيان ان السنة يوم النحر أن يرمي)

قال النووی رح: فیہ فوائد کثیرة ...... منها التبرك بشعرہ صلی اللہ علیہ وسلم وجواز إقتنائہ للتبرك۔ (شرح مسلم: ۱:۴۲۱)

عن أنس بن مالك رضی اللہ عنہ لما رمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الجمرة ونحر نسکہ وحلق وناول الحالق شقہ الأیمن فحلقہ ثم دعا أبا طلحة الأنصاری فأعطاہ إیاہ ثم ناولہ الشق الأیسر فقال احلق فحلقہ فأعطاہ أبا طلحة فقال إقسمہ بین الناس۔

مسلم: ۱:۴۲۱: ترمذی: ۱:۱۱۱: باب ماجاء بأیّ جانب الرأس یبدأ)

عن عثمان بن عبد اللہ بن موهب قال أرسلنی أهلی إلی أم سلمة بقدح من ماء فجاءت بجلجل من فضة فیہ شعر من شعر النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم وکان إذا أصاب الإنسان عین أو شیئ بعث إلیها مخضبة قال فاطلعت فی الجلجل فرأیت شعرات حمراء۔

(بخاری: ۲:۸۷۵: باب ما یذکر فی الشیب۔)

قال صاحب عمدة القاری: قال الکرمانی إن الإنسان إذا أصابہ عین أو شیئ من الأمراض بعث أهلہ إلی أم سلمة مخضبة ویجعل فیها ماء وشیئ من الشعر المبارك فیحصل لہ الشفاء۔ (عمدة القاری: ۱۸:۷۹۔)

التبرك بشعرہ وظفرہ صلی اللہ علیہ وسلم

عن عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد اللہ قال أوصی عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ عند الموت فدعا بشعر من شعر النبي وأظفار من أظفارہ وقال إذا مت فخذوا الشعر والأظفار ثم إجعلوہ فی کفنی ففعلوا ذلك۔ (طبقات الکبری: ۵:۴۰۶)

التبرك بقمیصہ وظفرہ صلی اللہ علیہ وسلم

إن معاویہ رضی اللہ عنہ لما قرب موتہ أوصی أهلیہ فقال: إتقوا اللہ فإنہ لا واقي لمن لا یتقی اللہ .... ثم قال إن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسانی قمیصاً فرفعتہ وقلم أظفارہ یوما فأخذت قلامتہ فجعلتها فی قارورة فإذا مت فألبسونی ذلك القمیص واسحقوا تلك القلامة: وذرّوها فی عینی وفی فمی فعسی اللہ أن یرحمنی ببرکتها۔

(تاریخ الأمم والملوك: ۴:۲۴۱: لجریر الطبری و الکامل فی التاریخ: ۳:۲۷۰ لفخر الدین ابن الاثیر۔)

وقد ورد من غیر وجہ أنہ ای معاویة أوصی إلیہ أن یکفّن فی ثوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

الذی کساہ إیاہ وکان مدّخرا عندہ لهذا الیوم وأن یجعل ما عندہ من شعرہ وقلامة أظفارہ فی فمه وأنفه وعینیه وأذنیه۔ (البدایة النهایة: ۸:۱۲۹: لابن کثیر۔)

التبرك بدعائه صلی اللہ علیه وسلم

عن أبی هریرة رضی اللہ عنه قال کان الناس إذا رأوا أول الثمر جاء وا به الی النبی صلی اللہ علیه وسلم فإذا أخذہ رسول اللہ قال اللّٰهم بارك لنا فی ثمرنا وبارك لنا مدینتنا........۔ (مسلم: ۱:۴۴۲: باب فضل المدینة)

قال العلماء: کانوا یفعلون ذلك رغبة فی دعائه صلی اللہ علیه وسلم للثمر والمدینة۔

(شرح المسلم: ۱:۴۴۲۔)

وفقنا اللہ للتبرك بآثار الرسول صلی اللہ علیه وسلم وللتمسك بسنته: آمین۔

من جواهر الأشعار: لعبد القادر بن یوسف القضفوری ۔

جامع
کے۔ ایم۔ الیاس لطیفی
ملابرم کیراله

الأشعار البدیعة فی الألغاز

١۔ خلیلان ممنوعان من کلّ لذّة
یبیتان طول اللیل یعتنقان
هما یحفظان الأهل من کلّ آفة
وبعد طلوع الفجر یفترقان

٢۔ وبئر به ماء وفی الماء حیّة
وفی رأسها طیر من النور یلمع
إذا هبّ ریح نحوه طار مسرعا
وإن غاض ما فالحیّة الطیر تبلع

٣۔ زوجان ما جامعا إلّا لدی السّراء
ولم یفت ولد من ذلك الماء
کم من سعید تبدّی من جماعهما
وکم شقيّ فلا یحصی بإیفاء

٤۔ وجاریة حبلی ولیست بحیّة
وفی بطنها ولد ولیس لها بعل
إذا عطشت عاشت وعاش ولیدها
وإن شربت ماتت ومات بها الحمل

٥۔ وآکلة بغیر فم وبطن !
لها الأشجار والحیوان قوت
فإن أطعمتها إنتعشت وعاشت
ولو أسقیتها ماء تموت

الجوابات: (۱) باب البیت (۲) السراج (۳) القلم والدواة۔ (۴) السفینة۔ (۵) النار

مُناجات بدرگاہِ قاضیُ الحاجاتؐ

یا خدا میری بگڑی بنا دے — سوئی قسمت کو میری جگا دے

علم و عرفاں کا چسکہ لگا دے — ہم ہیں جاہل تو آموز گا رے

غرقِ عصیاں ہوں اب تو بچا لے — اپنی رحمت میں مجھ کو چھپا لے

بخش دینا گناہوں کو سارے — اپنے فضل و کرم سے مٹا دے

ہر طرف سے ہیں ظلمت کے دھارے — پار کشتی کو تو اب لگا دے

ہم تو جور و ستم کے ہیں مارے — جی رہے ہیں ہم تیرے سہارے

تیری بخشش سے اے رب ہمارے — ہیں بہارے بہارے بہارے

اے خدا ہم کو حاجی بنا دے — اپنے کعبہ میں ہم کو بُلا لے

آبِ زمزم بھی جی بھر پلا دے — ہر تمنّا کو پُوری کرا دے

یا خدا اب مدینہ دکھلا دے — شوقِ نظّارہ دل میں بڑھا دے

بابِ جبریلؑ و صدیقؓ بتا دے — بابِ فاروقؓ و عثمانؓ دکھا دے

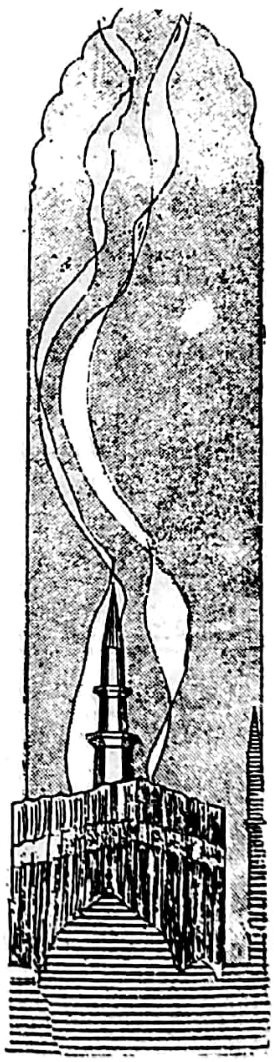
بابِ حیدرؓ سے آگے کرا دے — صدقہ اصحاب کا کچھ دلا دے

میرے آقا کے چہرے کے آگے — ماند پڑتے ہیں یہ چاند تارے

جبلِ ثور و حرا کے نظارے — اور اُحد کی پہاڑی دکھا دے

جب سے افسر یہ تیرا ہوا ہے — تو بھی اس کا یقیناً ہوا ہے

سبز گنبد کے دیکھے نظارے
افسر آنکھیں سرِ رہ بچھا دے



از
حکیم ڈاکٹر سید افسر پاشاہ افسر
شفاء ڈسپنسری۔ گڑیاتم

منظوم تفسیر سورۂ اخلاص

• بجناب سید سیف الدین لطیفؔ آرکاٹیؒ

بول اے مشرک[1] زباں سے قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدْ
کیجئے تصدیق دل میں ہے وہ اَللّٰہُ الصَّمَدْ

لَمْ یَلِدْ ہے ذات اس کی اور وَلَمْ یُوْلَدْ ہے وہ
لَمْ یَکُنْ لَّہٗ صاف کہہ اور بول کُفُوًا اَحَدْ

سورۂ توحید کے معنی یہی لاریب ہے
وہ نہیں زائیدہ[2] کس کا اور نہیں کس کا ولد[3]

نا اسے مادر[4] پدر[5] ہے نہ اسے فرزند[6] و زن[7]!
خویش[8] و خواہر[9] سے منزہ[10] اس کی ہے ذاتِ احد[11]

احدیت[12] میں اس کی کوئی کیوں کر رقم زن ہو سکے
ایک ایسا ہے نہیں ہے جس کو امکانِ عدد

جب تلک تو معنیٔ توحید سے آگہ نہیں!
حرف[13] تیرے شرک کا ہرگز نہ ہوگا تجھ سے رد

کام رکھ منقول[14] سے معقول[15] کا تابع نہ ہو!
بن گئے مشرک بہت اس راہ میں اہلِ خرد

ورد میں دائم تو رکھ قرآن و تفسیر و حدیث
ہے یہ تیرے حشر میں ہادی و حامی و مدد

کیوں نہ ہو رشکِ سحر صبحِ قیامت تک لطیفؔ
نورِ توحیدِ الٰہی سے تری کنجِ لحد[16]!

---

۱ شاعر کے نزدیک مخاطب سورۃ کا مشرک ہے۔ ۲ جننے والا۔ ۳ نسل بچہ ۴ ماں۔ ۵ باپ ۶ بیٹا ۷ بی بی
۸ قرابت دار ۹ بہن ۱۰ پاک۔ ۱۱ اکلوتی ہستی ۱۲ اکلوتا ہونا ۱۳ عیب۔ ۱۴ مذہبی کتاب
۱۵ منطق و فلسفہ اور یونانی الٰہیات (یونانی فلسفۂ الٰہیات سراپا شرک ہے۔) ۱۶ قبر کا کونا۔ (عطیہ ر ع ص ن)

غزل

سید شاہ معین الدین حسینی
المعروف بہ شاہ خاموشؔ

اپنی صورت دیکھ جب دل اپنا گھبرانے لگا
پھر تو ملنا کیوں کسی کا ہم کو خوش آنے لگا

عالمِ وحشت بسا ہے آ کے دل میں اس قدر
شہر صحرا سا مری آنکھوں میں دکھلانے لگا

قطرۂ آنسو ہمارے رہ گئے منہ دیکھتے!
خاکِ در تن آتشِ دل سے جو جل جانے لگا

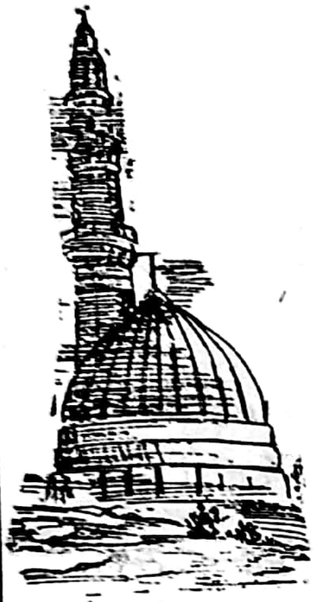
بن گیا تارِ نظر زنجیرِ پا اپنا ہی خود!
بال بال اُس زلف کا دیکھا جو بل کھانے لگا

محوِ حیرت سرو تھا اور گل ہوا فرشِ زمین
یار جب سوئے چمن تشریف فرمانے لگا

کیا حقیقت میری اس کے منہ میں جو بھاؤں مگر
یہ غنیمت ہے کہ میرے سر میں وہ بھانے لگا

کیوں نہ ہو خاموشؔ گوش و چشم اپنی بند کر
صورتِ سرمد کی صدا جیسے کہ سن پانے لگا

پیش کش: سید نظیر احمد قادری، بنگلور



نعتِ شریف

● علیم صبا نویدی

حضور سیّدِ کونینؐ اک نظر کرنا
میں اک قطرۂ ناچیز ہوں گہر کرنا

کسے نصیب ہوا اے صبائے وقت یہاں
نبیؐ کے عشق میں یوں عالمی سفر کرنا

بھٹک رہا ہوں میں کوچوں میں غیر کی ہر سُو
نظر ہے فرشِ رہِ نور، دل میں گھر کرنا

دل و نگاہ میں اُترے ہیں آپؐ کے جلوے
ہے سہل معرکۂ جاں کو اب کے سر کرنا

درِ درود پہ رکھ کر سرِ شعور سدا
مقامِ عشقِ نبیؐ کو بلند تر کرنا

میں اپنے آپ میں کھو جاؤں شاہِ دیںؐ چپ چاپ
بساطِ دل پہ ذرا خود کو جلوہ گر کرنا

صبا نویدی کی بس اتنی آرزو ہے حبیبؐ
کہ اس فقیر کی سوچوں کو تاجور کرنا

● پیش کش: ڈاکٹر حکیم محمّد علی۔ ویلور

نورِ عرشِ مبین سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

یس۔ محمد یوسف شماس ایم اے، قاضی پورہ ادھونی

رحمۃ للعالمین، راحۃ العاشقین
شہریارِ زمیں، تاجِ عرشِ بریں
زلف ہے عنبریں، چہرہ دل نشیں
تیری مہر حسیں، اے عرب کے مکیںؐ!
نورِ عرشِ بریں، نورِ عرشِ بریںؐ
سیّد المرسلیں، سید المرسلیںؐ

مصطفٰےؐ، مجتبٰی، مبتدا، منتہاؐ
تم ہو شمس الضحیٰ، تم ہو بدر الدجیٰؐ
آپؐ کی ذاتِ اقدس پہ ہر شئے فدا
میرے ہر مو سے ہو جاری ہے صلّ علےٰ
مرحبا آفریں، مرحبا آفریں!
سیّد المرسلیںؐ، سید المرسلیںؐ

عرشِ اعلیٰ میں تھا، آدمؑ و حوّاؑ میں تھا
دستِ بیضا میں تھا، روحِ عیسیٰؑ میں تھا
طورِ سینا میں تھا، لیلِ اسرا میں تھا
چمکا کعبہ میں تھا اور طیبہ میں تھا
تیرا نورِ مبیںؐ، تیرا نورِ مبیںؐ
سیّد المرسلیںؐ، سید المرسلیںؐ



اک ترے واسطے دوڑے لیل و نہار
ہے ترے واسطے کہکشاں کا سنگھار
سارے عالم میں تجھ سے رچی ہے بہار
شش جہت کا تو ہے اک حسیں تاجدار
تیرے زیرِ نگیں، تیرے زیرِ نگیں
سیّد المرسلیںؐ، سیّد المرسلیںؐ

رات پونم کی تھی آئے جب مصطفٰےؐ
دیکھا جابرؓ نے جب روئے خیر الوریٰؐ
یہ کہا "جب میں دونوں کو تکتا رہا"
"بدر سے بھی منوّر رخِ والضحیٰؐ"
تیرا چہرہ حسیں، تیرا چہرہ حسیں
سیّد المرسلیںؐ، سید المرسلیںؐ

ہر مسلماں پہ تیرا ہی احسان ہو!
کچھ تو شماس پہ تیرا فیضان ہو
جب زمانے میں آپؐ ہی کا فرمان ہو
پھر مسلمان کیوں کر پریشان ہو
فاتح الفاتحین، فاتح الفاتحیں
سیّد المرسلیںؐ، سیّد المرسلیںؐ



نعت

سید سراج الدین منیر

طاہر و اطہر پاک و مطہر صلی اللہ علیہ وسلم
سیّد و سرور، ہادی و رہبر صلی اللہ علیہ وسلم

حُسن کا مظہر نور کا پیکر صلی اللہ علیہ وسلم
حق کا پیمبر شاہدِ داور صلی اللہ علیہ وسلم

صاحبِ قرآں محبوبِ یزداں وجہِ ظہورِ عالمِ امکاں
قاسمِ کوثر شافعِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم

آپ ہی اوّل آپ ہی آخر آپ ہی باطن آپ ہی ظاہر
کوئی نہیں ہے آپ کا ہمسر صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کی عظمت آپ کی رفعت کس سے بیاں ہو کس کو ہے قدرت
نقشِ قدم ہیں عرشِ بریں پر صلی اللہ علیہ وسلم

میں ہوں فدائے آلِ پیمبر نقش ہیں دل زخمِ بہتّر
اے میرے سیّد اے میرے سرور صلی اللہ علیہ وسلم

بخش ہی دے گا روزِ قیامت جب میں پڑھوں گا نعتِ رسالت
خالقِ اکبر داورِ محشر صلی اللہ علیہ وسلم

کہہ دو منیرؔ اسلام یہی ہے عاشقِ حق کا کام یہی ہے
ذکرِ خدا و ذکرِ پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

پیش کش :- سید علی احمد قادری کلیم حیدرآباد۔

★ سانیٹ (SONNET)

ٹمل ناڈو کے ہردلعزیز استاد، شاعر و ادیب

پروفیسر محبوب پاشا محبوب

کی رحلت پر (۲۲ اپریل 2001ء مدراس)

●

— علیم صبا نویدی —

●

اک کائنات تم سے بچھڑ کر بچھڑ گئی
اک تم ہی بزمِ فکر میں اہلِ کمال تھے
تم لاجواب، صاحبِ نظر، بے مثال تھے
لمحوں میں زندگانی کی خوشبو سکڑ گئی

تم کیا گئے کہ محفلِ شعر و ادب اُداس
دانشورانِ شہرِ تمنا ہیں سوگ میں
ہیں سود خوارِ اردو گرفتار روگ میں
مدراس کی فضائیں، زمیں، روز و شب اُداس

سب دل کی دھڑکنوں میں سکوت آفریں لہو
ہر اک نظر خموش، لبوں پہ اُداسیاں
ماتم کدے کی گونج ہے احساس میں رواں
زخمی فضائیں، آہوں کا منظر ہے چار سُو

تم کیا گئے کہ ختم ہوئی شانِ آرکاٹ
چپ ہو گئی زبانِ نوابانِ آرکاٹ

●

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولیمہ

کب اور کیوں....؟

بے شک یہ مثل مشہور ہے کہ "شُنیدہ کے بود مانندِ دیدہ"، مگر بسا اوقات یہی مثل ذرا سی ترمیم کے ساتھ "شُنیدہ ہم بود مانندِ دیدہ" بھی بن کر سامنے آجاتی ہے۔ چناں چہ بعض مقامات پر نکاح کے تھوڑی دیر بعد دعوتِ ولیمہ کے انعقاد کی خبریں تو سُننے میں آتی تھیں مگر ابھی حال میں ایک جگہ نکاح کا موقعہ ملا، جو عصر کے بعد تھا اور ساتھ ہی مغرب کے بعد دولھے میاں کی طرف سے ولیمہ کی ضیافت بھی طے شدہ تھی۔ یہ میرے دل میں خلجان اور شکوک وشبہات کا باعث بنی۔ کیوں کہ ایسا آج تک کسی نے بھی نہیں کیا اور نہیں سُنا۔ یہ عام رواج اور معمول کے خلاف ولیمہ تھا۔

میں نے اس کی اصلیت اور حقیقت کی حل طلب وضاحت کے لیے حضرت مولانا قادری حکیم سیّد افسر پاشاہ صاحب قاسمی صبغۃ اللّٰہی مدظلہٗ العالی کو تکلیف دی تو اوّلاً تو انھوں نے انکار کیا۔ اپنی مصروفیات اور کثرتِ کار کو سامنے رکھا پھر میرے اصرار پر بمشکل اقرار کیا اور آمادگی اور رضامندی ظاہر کی۔

میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالےٰ حکیم صاحب موصوف کی عمر واقبال میں برکت اور علم وعمل میں ترقی عطا کرے۔ آمین۔

آپ کا یہ مضمون "ولیمہ..... کب اور کیوں؟" کے نام سے قارئینِ "اللطیف" کی خدمات میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، جو وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ابو محمد سیّد محمد عثمان قادری

پرنسپال دارالعلوم لطیفیہ عربک کالج

حضرت مکان ۔ ویلور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سُبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام اس کے آخری پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن پر قرآن مجید نازل ہوا اور پوری دنیا کے حق میں ایک رہبر اور آخری پیغام ثابت ہوا۔

بعد حمد و صلوٰۃ کے عرض ہے کہ تمام اہلِ حق علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ احکام شرعیہ کا استنباط چار ادلہ سے ہوتا ہے۔

۱۔ کتاب اللہ۔ ۲۔ سنّت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ ۳۔ اجماع امتِ مرحومہ۔ ۴۔ قیاسِ مجتہدینؒ۔

پھر ان چاروں میں سب سے بڑھ کر سب سے افضل کتاب اللہ کا مرتبہ تسلیم کیا گیا ہے۔ نصِ قرآنی سے جو حکم صادر ہو۔ دوسری طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد سنّتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد اجماعِ امّت، پھر قیاسِ مجتہدین کا درجہ ہے۔

علامہ امام طحطاویؒ اجماع کی تعریف میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"والاجماعُ قال فی الشرح اجمع المسلمون من لدن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الیٰ یومنا ھٰذا"

(طحطاوی ص۳۰۲) یعنے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے آج تک جس بات پر علمائے اسلام کا اتفاق ہو جائے وہ اجماع کہلاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ولیمہ کی ضیافت آیا واجب ہے یا سنّت؟ اور یا مستحب؟ بعض علماء نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ اس قول کی بناء پر کہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بصیغۂ امر سخت تاکید فرمائی ہے کہ اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ (ولیمہ کر اگرچہ ایک ہی بکری کیوں نہ ہو۔) لیکن اکثر علماء کی رائے اس کے استحباب پر ہے۔

یہاں ایک بات اور عرض کئے دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ عملی میدان کی دو شقیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہرِ شریعت اور دوسری باطنِ شریعت۔ ظاہرِ شریعت کو مسئلہ کہتے ہیں اور باطن شریعت کو تقویٰ۔ پھر مسئلہ پر عمل یا اس کا تعلق عوام سے ہوتا ہے، خواص سے نہیں۔ اور تقویٰ کا تعلق خواص اور اخصُّ الخواص سے ہوتا ہے۔ عوام سے کم یعنے ظاہر بین محض ظاہری مسئلہ پر عمل کریں گے اور باطن بین ظاہر مسئلہ کے ساتھ ساتھ اس کی گہرائیوں میں پہنچ کر خوف و خشیت، تقویٰ و طہارت پر بھی ان کی نظریں ہوں گی اور اُس پر عمل کریں گے۔ عوام کا تعلق مسائل سے ہوتا ہے۔ خواص کا تعلق مسائل کے ساتھ مبنی بر احتیاط تقویٰ پر ہوتا ہے۔

غرض آج بھی ایک طبقہ الحمدللہ ایسا ہے جو فرائض و واجبات سے لے کر سُنن و مستحبات پر بھی عمل کرنے کا خواہاں اور جویاں ضرور ہے۔ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک ادا اور ایک ایک سنّت پر عمل کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہے اور وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ واجب ہے، سنّت ہے یا مستحب ہے۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا حکم فرمایا؟ اور کب فرمایا؟ اور اس پر کس طرح آپ کا عمل تھا؟

یہ تلاش و جستجو کرنے والے درحقیقت سچّے اور پکّے عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتے ہیں۔ جنھیں ہر وقت و ہر آن یہی خیال دامن گیر رہتا ہے کہ قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کذا وعمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا۔

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل تھا۔) یہی ہر وقت ان کا زاویۂ نگاہ اور حاشیۂ خیال ہوتا ہے۔ کبھی اس کے اندر حیص بیص اور حیلے حوالے اور بہانے انھوں نے نہیں تراشے اور نہیں نکالے اور ایسا گوارہ بھی نہیں کیا تو پھر وہ لیت ولعل، مکروحیل کیسے گوارہ کرتے؟ جب کہ وہ اپنے مطلب میں مست ومگن ہیں اور انھیں ایک ہی لگن ہے اور دھن ہے اپنے رسول مقبول سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر ادا پر فدا ہونا اپنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔

غرض اس طبقہ کے نزدیک سنّت تو سنّت ایک مستحب کا بھی وہی مقام ومرتبہ ہے جو فرض وواجب کا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ طبقہ حیلوں بہانوں کی چکر میں نہیں پڑے گا، بلکہ وہ یہی سوچے گا کہ اس سلسلہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم اور کیا منشا اور نظریہ تھا؟ پھر آپ کے صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعین کا اس پہ کیا عمل تھا اور اجماعِ امت جس کا دوسرا نام تعاملِ امت بھی ہے، ان حضرات کا عمل کیسا تھا؟؟

مجھے مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پس اختصار کے ساتھ مسئلہ کے چند اہم اور ضروری گوشوں کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جس سے یہ دورِ حاضر کا الجھا ہوا مسئلہ سلجھ کر خوب واضح طور پہ سامنے آجائے۔

ولیمہ لغت کی روشنی میں

لفظ ولیمہ عربی لفظ ہے اور "وَلَم" سے نکلا ہے اور وَلْمٌ آپس میں ایک دوسرے سے ملنے اور جمع ہونے کو کہتے ہیں۔ اب اس کی تحقیق کے لیے پہلے ہم اہلِ زبان سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے ہاں اس کے کیا معنیٰ ہیں؟

اہلِ لغت میں سے ابنِ عبد البرؒ نے علامہ خلیل، ثعلب، جوہری اور ابنِ اثیر سے یہ نقل کیا ہے کہ ان الولیمۃ ھی الطعام فی العرس خاصّۃ: (بلا شبہ یہ ولیمہ (دولھے کی طرف سے) دولھن والوں کے لیے خاص ضیافت ہے۔)

اب اس پہ علامہ ابنِ رسلانؒ نے فرمایا کہ: "وقول اھل اللغۃ اقوی لانھم اھل اللسان وھم اعرف بموضوعات اللغۃ واعلم بلسان العرب" (بذل المجھود فی حل ابی داؤد: ص ۲۴۰: ج ۳) لغت والوں کی باتیں زیادہ معتبر اور قوی ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ زبان والے ہیں اور وہی لغت کے محل ومقام کو سب سے زیادہ سمجھنے والے اور عربی زبان کے جاننے والے ہیں۔

دولھے کی طرف سے عروس والوں کو دی جانے والی ضیافت کا نام جس طرح ولیمہ ہے اسی طرح اور بھی اقسام وانواع کی مختلف ضیافتیں ہیں جنھیں اہلِ لغت نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ حدیث مسلم شریف کے حاشیہ میں اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

"الضیافات ثمانیۃ انواع الولیمۃ للعرس والخُرس للولادۃ والاِعذار للختان والوکیرۃ للبناء والنقیعۃ لقدوم المسافر ماخوذۃ من النقع وھو الغبار والعقیقہ یوم سابع الولادۃ والوضیمۃ الطعام عند المصیبۃ والماْدبۃ ضیافۃ بلا سبب" (مسلم شریف: ص ۴۵۸: ج ۱، وکذا

موجود فی ھامش "بذل المجھود" بتغییر یسیر: ص: ۲۴۰: ج: ۳)

- یعنی ضیافتیں آٹھ قسم کی ہیں۔" دولہے کی طرف سے دولھن والوں کو دی جانے والی ضیافت کا نام "ولیمہ" ہے۔ نومولود کی خوشی میں ہونے والی ضیافت "خُرس" کہلاتی ہے اور ختنہ کی دعوت کو "اِعذار" کہتے ہیں، کسی مکان یا دکان کی نو تعمیر ہونے والی دعوت کا نام "وکیرہ" ہے اور کسی مسافر کی آمد پر ہونے والی دعوت "نقیعہ" ہے۔ لفظ "نقیع" نقع سے نکلا ہے۔ جس کے معنی غبار کے آتے ہیں۔ اور نومولود کے ساتویں دن والی ضیافت "عقیقہ" ہے اور کسی مصیبت پر کھایا جانے والا کھانا "وضیمہ" ہے اور بلا وجہ اتفاقی دعوت کا نام "مادُبہ" ہے۔

اَوْلِمْ ولو بشاۃ قال العلماء من اھل اللغۃ والفقھاء وغیرھم الولیمۃ الطعام المتخذ للعرس مشتقۃ من الولم وھو الجمع لان الزوجین یجتمعان۔ (مسلم شریف: ص ۴۵۸: ج ۱)

(ولیمہ کرو ایک بکری ہی سہی۔ اہل لغت اور فقہاء میں سے علماء نے فرمایا ہے کہ "ولیمہ" یہ اس کھانے کا نام ہے جو دولھن والوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح ولیمہ "وَلَمْ" سے نکلی ہے جس کے معنی ہیں جمع ہونے کے اور یہاں زوجین (میاں بیوی) آپس میں ملتے اور جمع ہوتے ہیں۔)

امام ابو داؤدؒ نے اپنی کتاب میں "باب قلۃ المھر" کے تحت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث لائی ہے۔ اس کی شرح میں صاحب بذل المجھودؒ نے بڑی تفصیل لکھی ہے اور فرمایا کہ:

قال الازھریؒ الولیمۃ مشتقۃ من الولم وھو الجمع لان الزوجین یجتمعان وقال ابن الاعرابی اصلھا تمام الشیئ واجتماعہ وتقع علی کل طعام یتخذ لسرور وتستعمل فی ولیمۃ الاعراس بلا تقیید۔ (بذل المجھود فی حل ابی داؤد: ص ۲۴۰: ج ۳)

(ازہریؒ فرماتے ہیں کہ ولیمہ دراصل لفظ وَلَمْ سے مشتق (نکلا) ہے جس کا معنی ہے جمع ہونا اور یہاں میاں بیوی دونوں جمع ہوتے ہیں (جمع سے ہی "جماع" نکلا ہے اور یہاں اسی کی طرف رمزاً باریک اشارہ ہے۔) ابن اعرابی کہتے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا پوری طرح سے جمع ہونا ہے اور یہ ہر اس کھانے پر جو خوشی کے موقعہ پر بنایا جاتا ہے صادق آتا ہے۔ اور پھر وہ دولھن والوں کی ضیافتِ ولیمہ میں بغیر کسی شرط و قید کے مستعمل ہوتا ہے۔)

نکاح اہلِ لغت کے نزدیک

کتاب النکاح ھو فی اللغۃ الضم یطلق علی العقد وعلی الوطئ قال الامام ابو الحسن علی بن احمد الواحدی النیسابوریؒ اصل النکاح فی کلام العرب الوطی وقیل للتزوج نکاح لانہ سبب الوطی۔ وقال ابو القاسم الزجاجی النکاح فی کلام العرب الوطی والعقد جمیعاً۔ (مسلم شریف: ص ۴۴۸: ج ۱)

ترجمہ: کتاب النکاح لغت میں پیش کے ساتھ ہے اور یہ عقد خوانی ہمبستری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ امام ابو الحسن علی بن

احمد واحدی نیشاپوری نے فرمایا کہ عربی زبان میں نکاح ہمبستری کو کہتے ہیں اور میاں بیوی کے ملن کو بھی نکاح کہتے ہیں کیوں کہ ہمبستری کا اصل سبب اور ذریعہ ہے۔ امام ابوالقاسم زجاجی کہتے ہیں کہ لفظ نکاح عربی زبان میں صحبت کرنے اور عقد خوانی دونوں معنوں میں ہے۔)

قال العلامة الزبیدیؒ فی شرح الاحیاء النِکاح بالکسر فی کلام العرب الوطئ وقیل العقد له وهو التزویج لانه سبب للوطی المباح وفی الصحاح النکاح الوطئ۔ (فتح الملهم شرح مسلم: ص۴۲۶: ج۳)

ترجمہ: علامہ زبیدیؒ "احیاء" کی شرح میں فرماتے ہیں کہ نِکاح کسرہ کے ساتھ عربی زبان میں ہمبستری کو کہتے ہیں اور کبھی عقد خوانی کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کا مطلب شادی کرنا ہے جو حلال صحبت کا ذریعہ ہے اور کتاب "صحاح" میں ہے لفظ نکاح کا مطلب صحبت کرنا ہے۔

"النکاح قیل هو مشترك بین الوطی والعقد وقیل حقیقة فی العقد مجاز فی الوطئ"۔

ھامش المشکوٰۃ: بحوالہ مرقات: ص ۲۶۷)

لفظ نکاح کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ جماع اور عقد کے درمیان مشترک لفظ ہے (یعنی دونوں پر صادق آتا ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نکاح کا حقیقی معنی عقد ہے اور مجازی (ظاہری) معنی صحبت و ہمبستری ہے۔

(النکاح هو مشتق من النکح) قال الفراء بضم ثم سکون اسم الفرج ویجوز کسر اوله وکثر استعماله فی الوطی وسمی به العقد لکونه سببه (الی ان قال) اذا نکح زوجته فالمراد الوطی"۔ (بذل المجهود: ص ۲۰۹)

ترجمہ: نکاح کا لفظ نکح سے نکلا ہے فراؔ کا قول نُکح نون کے پیش اور کاف کے جزم کے ساتھ عورت کی شرمگاہ کو کہتے ہیں۔ اور اسے بجائے پیش کے نون کو زیر لگا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور یہ زیادہ تر ہمبستری کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ عقدِ نکاح کے ساتھ موسوم بھی ہے کیوں کہ ہمبستری ہی اس کا اصل سبب ہے۔ (آگے کہتے ہیں بہ مقولہ) جب کسی نے اپنی بیوی سے نکاح کیا تو مطلب اس کا یہی ہے کہ اس نے صحبت کی اپنی بیوی سے۔

آگے فرماتے ہیں لان النکاح سبب یتوصل به الی قضاء الشهوة۔ بذل المجهود: ص ۲۰۹: ج۳)

(نکاح ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے خواہش پوری کی جاتی ہے۔)

غور فرمائیں یہاں یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ نکاح کے مفہوم میں خود صحبت اور ہمبستری کا راز مضمر ہے۔ آگے تفصیل کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ فافهم وتدبّر۔

ولیمہ احادیث کی روشنی میں

"موطا" امام مالکؒ میں "ما جاء فی الولیمہ" کے تحت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کا آخری جملہ "اَوْلِمْ ولو بشاة" پر حاشیہ میں یہ عبارت مذکور ہے۔

ثم الولیمة سُنّة او مُستحبة عند الجمهور ولیس بواجب کما ذهب الیه بعض الظاهریة

واختلفوا في وقت الوليمة له هو قبل الدخول ام بعده فحكى عياض ان الاصح عند المالكية بعد الدخول قال الشيخ خليل وهو ظاهر المذهب ۔ (المؤطاء للامام مالکؒ : ص ۱۹۸)

ترجمہ : جمہور علماء کے نزدیک ولیمہ یا تو سنت ہے یا مستحب مگر واجب نہیں ہے۔ اسی کی طرف بعض ظاہر گو حضرات کا رجحان ہے۔ ولیمہ کے وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ (یعنی مختلف آراء و اقوال ہیں) کہ وہ شب زفاف کے گزارنے سے پہلے ہے یا بعد میں؟ اس پر قاضی عیاضؒ کا قول ہے کہ مالکیوں کے پاس صحیح قول کے مطابق ولیمہ ہمبستری کے بعد ہی ٹھیک ہے۔ شیخ خلیلؒ نے بھی یہی کہا ہے اور یہی مذہب اور کھلا مسئلہ ہے۔

وعن انس رضی اللہ عنہ قال أَوْلَمَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حين بنى بزينب بنت جحش رضى الله عنها فاشبع الناس خبزاً ولحماً ۔ رواہ البخاری (مشکوٰۃ شریف باب الولیمۃ: ص ۲۷۸)

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ : اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے جب نکاح فرمایا تو (اس خوشی میں) لوگوں کو روٹی اور بوٹی کی دعوت ولیمہ دی اور لوگ اس سے خوب سیر ہو کر کھائے۔

اس حدیث کے بین السطور پر حاشیہ مذکور ہے کہ هذا يدل على ان وقت الوليمة بعد العقد بل بعد الدخول (اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ولیمہ کا وقت نکاح کے بعد بلکہ ہمبستری کے بعد ہے۔)

آگے حاشیہ میں یہ عبارت ہے : قوله "اولم ولو بشاة" اى اتخذ وليمة قال ابن الملكؒ تمسك بظاهره من ذهب الى ايجابها والاكثر على ان الامر للندب قيل انها يكون بعد الدخول وقيل عند العقد وقيل عندهما۔ واستحب اصحاب مالکؒ ان يكون سبعة ايام والمختار انه على قدر حال الزوج " (مرقات شرح مشکوٰۃ : ص ۲۷۸)

ترجمہ : ولیمہ کرو اگرچہ ایک ہی بکری ہو (مطلب یہ ہے کہ گو تھوڑا ہی سامان ہو مگر دینا چاہیے۔) ابن ملکؒ کہتے ہیں کہ جن حضرات کی نگاہ ظاہری الفاظ پر گئی انہوں نے اس کے وجوب پر استدلال کیا اور ولیمہ واجب قرار دیا لیکن اکثریت کی رائے مستحب پر ہے۔ (اب اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ولیمہ کب ہو؟) کسی نے کہا صحبت و ہمبستری کے بعد ہونا چاہیے کسی نے کہا عقد خوانی کے ساتھ ہو اور کسی نے دونوں کے بعد کہا ہے۔ اور مالکیوں نے سات دن تک ولیمہ کی ضیافت کو مستحب قرار دیا ہے۔ اور قول مختار اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ یہ دولھے کی بقدر وسعت و طاقت اور سہولت پر منحصر ہے۔

واضح ہو کہ یہاں مالکی حضرات نے جو سات دن کی قید لگائی ہے اس سے شاید ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو کہ دعوت ولیمہ صحبت و ہمبستری کے بعد ہی مناسب اور بہتر ہے۔ اس سے پہلے نہیں کیوں کہ یہ طویل مدت اور وقفہ اسی بات کی طرف اشارہ دیتا ہے کہ کبھی نکاح کے وقت دولھن ناپاک ہو (اسے ماہواری) آگئی ہو تو ایسی صورت میں ہمبستری تو ہو نہیں سکتی اس لیے ولیمہ کے سلسلہ کو جاری رکھ دیا کہ یہ سات دن تک جاری رہے اور جب دولھن پاک ہو جائے تو اس درمیان کی ہونے والی ضمنی ضیافت اب اصل میں داخل ہو کر اصلی اور حقیقی بن جائے۔

مسلم کی شرح "فتح الملہم" میں ہے !

واختلف العلماء فی وقت فعلہا فحکی القاضی ان الاصح عند مالکؒ وغیرہ انہ یستحب فعلہا بعد الدخول وعن جماعۃ من المالکیۃ استحبابہا عند العقد وعن ابن حبیب المالکیؒ استحبابہا عند العقد وعند الدخول۔

(فتح الملہم: ص ۴۸۵: ج ۳) ترجمہ (ولیمہ کب کیا جائے ؟) اس میں علماء کی مختلف رائیں ہیں قاضی نے یہ بات کہی ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں کا سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے کہ بیوی سے ہمبستری کے بعد ولیمہ کرنا مستحب ہے اور مالکیوں کی ایک جماعت نے اس کو نکاح خوانی کے بعد مستحب کہا ہے اور ابن حبیب مالکیؒ کے نزدیک نکاح کے بعد بھی مستحب ہے اور ہمبستری کے بعد بھی۔ (یعنی ان کے نزدیک چاہے نکاح کے بعد ہو یا صحبت کے بعد دونوں صورتیں جائز اور روا ہیں۔

شارح ابوداؤد نے اپنی شرح میں علی الاعلان بہ بانگِ دہل صراحتہً یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ولیمہ والا فعل وعمل دراصل شبِ زفاف کے بعد ہی تھا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: واختلف السلف فی وقتہا ھل ھو عند العقد او عند الدخول او عقبہ او یوسع من ابتداء العقد الی انتہاء الدخول علی اقوال قال السبکیؒ والمنقول من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہا بعد الدخول وفی حدیث انسؓ عند البخاری وغیرہ التصریح بانہا بعد الدخول لقولہ اصبح عروسا بزینبؓ فدعا القوم۔ (بذل المجہود فی حل ابی داؤد: ص ۲۴۰: ج ۳۔

ضیافتِ ولیمہ کے سلسلہ میں سلف کے نزدیک مختلف رائیں ہیں۔ آیا یہ نکاح کے ساتھ دی جائے یا اس کے بعد! یا ہمبستری کے وقت ہو یا اس کے بعد؟ اور یا اس کے اندر اتنی ڈھیل اور وسعت ہو کہ نکاح کے وقت سے صحبت وہمبستری تک کی مہلت ہو۔ یہ مختلف آراء اور اقوال ہیں امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل وعمل سے جو بات منقول ہے (سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیز ثابت ہے) وہ ہمبستری کے بعد ہی ہے۔ امام بخاریؒ وغیرھم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے صاف طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ولیمہ) ہمبستری کے بعد ہی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا اور صبح کی اس کے بعد لوگوں کو بلوایا (اور دعوت دی)۔

روزِ روشن کی طرح واضح اور صاف الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح فرمایا اس کے بعد شبِ زفاف گزار کر صبح کی پھر دعوتِ ولیمہ کے لیے لوگوں کو مدعو فرمایا۔

جب کوئی مسئلہ یا بات فعلِ رسول اور سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے تو پھر اس کے اندر حیلے بہانے تراشنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ پکے اور سچے عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اس میں پہلو تہی اور گنجائش سے کام لیں اب اتنی کھلی اور واضح حقیقت کے بعد پھر مزید تفصیل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ولیمہ فقہ اور تعاملِ امت کی نگاہ میں

امام اہل السنّت والجماعۃ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی اپنی کتاب میں رطب اللسان ہیں شبِ زفاف،

یعنی اس رات کے بعد جس میں زوجین کی یکجائی ہو شوہر کو چاہیے کہ اپنے اعزہ واحباب وغیرہ کی حسب استطاعت دعوت کرے۔ یہ دعوت ولیمہ کے نام سے مشہور ہے (سنّتِ موکدہ ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر برابر التزام رہا اور اپنے صحابہؓ کو بھی تاکید فرماتے رہے۔"

(علم الفقہ: حصہ ششم: ص ۴۲)

دیکھیے ان صریح اور واضح الفاظ کے بعد بھی کیا کسی کو مزید اشکال ہے؟ مشکوٰۃ شریف، بخاری شریف اور ابوداؤد شریف... کی احادیث سے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ثبوت کے بعد بھی پھر کیا اشکال رہ جاتا ہے؟ گو بعض علماء نے صرف نکاح کے بعد بھی ولیمہ کو جائز قرار دیا ہے، ناجائز تو نہیں کہا ہے۔ بحث تو یہاں افضل اور مفضول یعنی غیر افضل پر چل رہی ہے۔ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تعاملِ امّت کے تحت۔ سنّت تو بس یہی ہے کہ ولیمہ بیوی سے صحبت کے بعد ہی ہو یہی بہتر ہے اور افضل طریقہ ہے۔

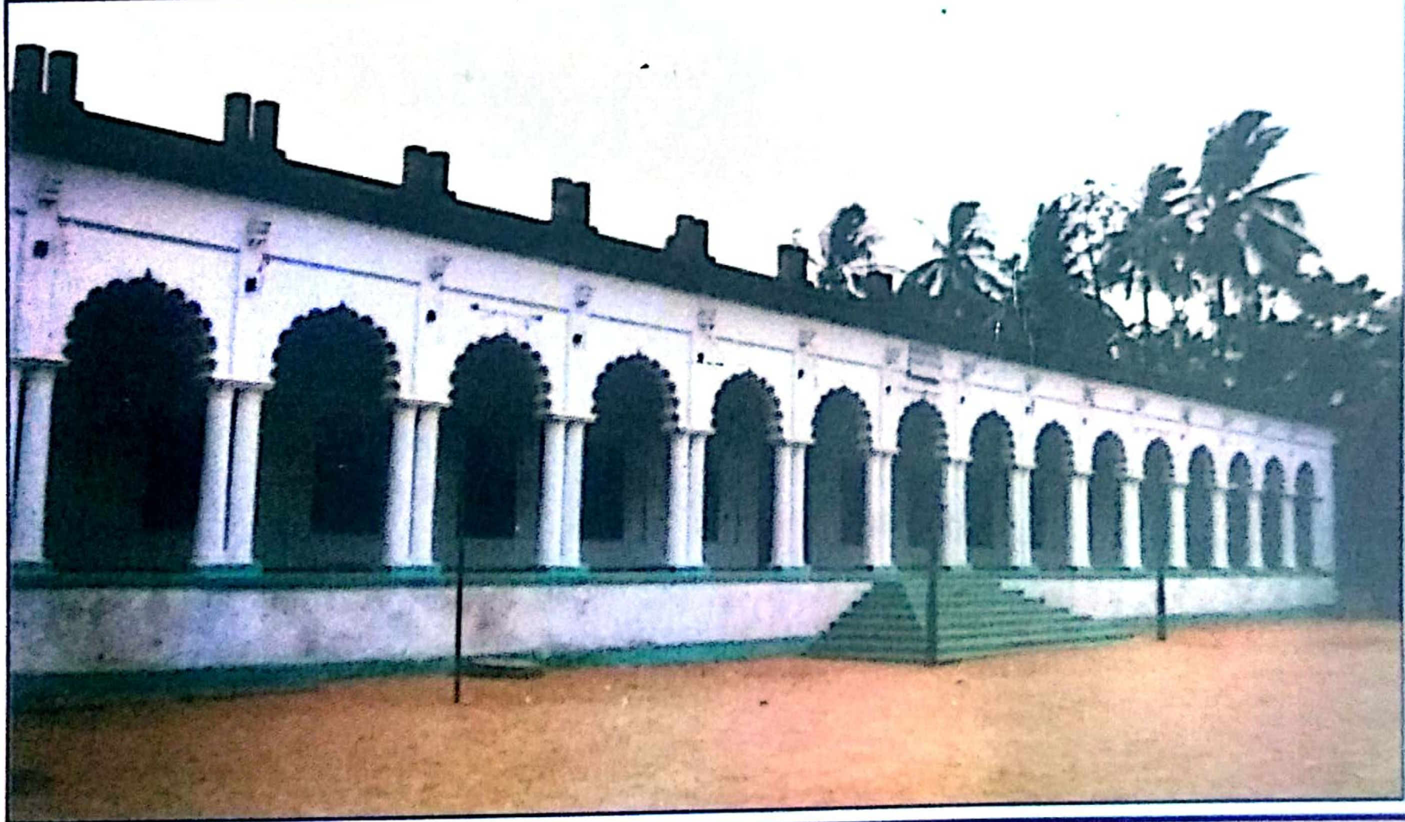
ویسے "عند العقد" اور "عند النکاح" کے الفاظ سے خلطِ مبحث کے طور پر بعض علماء نے قبل الدخول (صحبت سے پہلے) عند الدخول (صحبت کے وقت) اور بعد الدخول (صحبت کے بعد) والے مطالب و معانی نکالے ہیں حالاں کہ ان الفاظ میں تھوڑا سا غور و خوض کرنے پر تطابق و توافق (مُطابقت و مُوافقت) کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اور سب ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

چناں چہ آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا کہ اصطلاح لفظِ نکاح اور عقد کے قریب قریب ایک معنی اور مطلب ہے۔ یعنی جماع کرنے اور ہمبستری کے ہی آتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ نکاح کے بعد یا عقد کے بعد ولیمہ کیا جائے تو اس کا مطلب یہی تو ہے کہ شبِ زفاف کے بعد ہی ولیمہ ہوتا ہے اور اس سے پہلے نہیں۔ "بعد النکاح" کا مطلب ہوا صحبت کے بعد اور "بعد العقد" کا بھی ٹھیک یہی مطلب ہے کہ ہمبستری کے بعد ولیمہ ہونا چاہیے۔

اب الفاظِ حدیث اور علمائے لغت کے درمیان تطبیق بھی ہو گئی اور اشکال بھی دور ہو گیا۔ دونوں ایک ہی معنی اور ایک ہی مطلب میں ہیں اور اسی پر شروع سے امّت مسلمہ مرحومہ کا عمل چلا آ رہا ہے۔

ھٰذا ما عندی واللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

سالنامہ اللطیف ویلور



دار العلوم لطیفیہ کا ایک منظر

دار العلوم لطیفیہ مکانِ حضرت قطب ویلور